Rizvi S. M.

Tarikh-i-Deoband.

تاریخ دیوبند

دیوبند کی تاریخ ، قدامت ، وجہ تسمیہ

اور

دارالعلوم دیوبند کا نشو و ارتقاء اور اس کے علمی و تاریخی
حالات

از

سیّد محبوب رضوی

صفحات ـــــــ ۱۸۰

قیمت ـــــــ دو روپے

تعداد طبع ـــــــ ۱۰۰۰

مطبوعہ ـــــــ اشوک پریس، دہلی

شائع کردہ ـــــــ ادارہ تاریخ دیوبند

1953

فہرست مضامین

پیش لفظ

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

اثر خامہ

فخر الاماثل حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند

غیر معمولی قدامت "شئے" کو قدرتاً تاریخی بنا دیتی ہے

اس لئے دیوبند جو سہارنپور کے ضلع میں بہت ہی قدیم بستی اور مسلمانوں کی قدیم تہذیب و تمدن کی یادگار ہے، بلاشبہ تاریخی حیثیت رکھتی ہے، کم و بیش دو تین ہزار سال تک اس کی آبادی کا تاریخی طور پر پتہ چلتا ہے۔

معنوی حیثیت سے عظمت اسلامی کی سو سالہ یادگار دارالعلوم دیوبند اسی بستی میں واقع ہے جس نے اس کی تاریخی حیثیت کو شہرت و عظمت کے لحاظ سے چار چاند لگا دیئے ہیں، عموماً دیوبند کی شہرت و عظمت اور دنیائے اسلام بلکہ پوری دنیا میں اس کا تعارف دارالعلوم ہی کی وجہ سے ہے،

دیوبند کی اس شہرت عامہ کی وجہ سے قدرتاً دلوں میں یہ آرزو موج زن تھی کہ اس کے تاریخی اور جغرافیائی حالات سامنے آئیں اور جس طرح وہ اپنے اسم و معنیٰ کے لحاظ سے دلوں میں متعارف ہے اسی طرح اپنی تاریخ کے لحاظ سے بھی جانا پہچانا بن جائے،

مقدمہ

پر تاریکی کا گہرا پردہ پڑا ہوا ہے اور افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایسے باعظمت شہر کی ابتدائی تاریخ کا خاطر خواہ انکشاف نہیں ہوتا اور قدیم تاریخی حالات معلوم کرنے کے لئے ایسے ذرائع جنھیں تاریخی نوعیت دی جاسکے یک سر معدوم ہیں،

تاریخ نویس جب تاریخی مواد فراہم کرنے کی جستجو کرتا ہے اور منتشر و پراگندہ واقعات پر غور و خوض کرنے کے لئے قابلِ اعتبار ذرائع پر نظر ڈالتا ہے تو مختلف و متضاد زبانی روایتوں کے انبار میں تحقیق کی تشنگی کا دور کرنا مشکل ہوجاتا ہے، ظاہر ہے کہ ان حالات میں تاریخ نویس کا اپنے فرائض سے باحسن وجوہ عہدہ برآ ہونا بہت دشوار ہے!

تاریخ کے صفحات میں سب سے پہلے اکبر کے عہد میں ابو الفضل کی آئین اکبری میں دیوبند کا ذکر ملتا ہے، البتہ انیسویں صدی سے بعض حضرات نے اس کی تاریخ کی جانب فی الجملہ توجہ کی ہے اس سلسلہ میں سب سے پہلی تحریر مولانا فصیح الدین دیوبندیؒ کی ہے، انھوں نے ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء میں ضلع سہارنپور کا جغرافیہ لکھا تھا اس میں ضمناً دیوبند کا ذکر بھی کیا ہے، اس کے بعد متصلاً ہی ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء میں پنڈت نند کشور ڈپٹی کلکٹر ضلع میرٹھ نے صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ کی جانب سے ضلع سہارنپور کی تاریخ مرتب کی ہے اس میں کسی قدر تفصیل سے دیوبند کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے،

عربی زبان کے مشہور ادیب مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ والد ماجد شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن نور اللہ مرقدہٗ، نے بھی اپنے رسالہ "الہدیۃ السنیۃ" میں دیوبند کی نسبت اجمالاً چند باتیں لکھی ہیں۔

راقم الحروف کے دل میں عرصہ سے یہ خواہش چٹکیاں لے رہی تھی کہ دیوبند کی تفصیلی

تاریخ مرتب کر کے پیش کی جائے، ظاہر ہے کہ یہ خوش کن اقدام سہل نہ تھا، تاریخ نویس کو واقعات کے جمع و تسوید اور ترتیب میں جو جاں گسل دشواریاں اور صبر آزما دقتیں پیش آتی ہیں اُن کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں اس قسم کی دشوار گذار وادی سے گذرنا پڑا ہو، اس نوع کی مشکلات میں اُس وقت اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے جب کہ خاطر خواہ مواد موجود نہ ہو، واقعات منتشر اور بکھرے ہوئے ہوں، اسباب و علل جو تاریخ کی جان ہیں تحقیق و تدقیق کے محتاج ہوں، مجھے دیوبند کی تاریخ کے لئے ایک ایک واقعہ کے تفحص و تحقیق میں برسوں سرگرداں رہنا پڑا ہے تب کہیں جاکر واقعات کا یہ مجموعہ مرتب ہو سکا ہے، اس بنا پر اگر یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ ؎

لایا ہوں اس طرح دل صد پارہ ڈھونڈ کر ٹکڑا جہاں پڑا کوئی دیکھا اٹھا لیا!

بہر حال اس سلسلہ میں میری امکانی جد و جہد، تلاش و تجسس اور چھان بین سے جس قدر قابل اعتبار حالات دستیاب ہو سکے وہ پیش کر دیئے گئے ہیں، اور گو معلومات کا بہت محدود ذخیرہ پیش کیا جا سکا ہے تاہم امکانی سعی و تلاش کے نتائج سے جو ناتمام مرقع تیار ہو سکا ہے وہ آئندہ صفحات میں نظر آئے گا۔

میں نے واقعات کے بیان میں بالعموم تو یہ کوشش کی ہے کہ تحریری ماخذ کو بنیاد قرار دیا جائے، مگر اکثر واقعات ایسے بھی ہیں جو پُرانے لوگوں سے سُن کر بیان کئے گئے ہیں، اس صورت میں شہادت تائیدی کے مقابلہ میں شہادت تردیدی کا زیادہ خیال رکھا ہے، یعنی اگر کسی واقعہ کے متعلق کوئی مخالف بات معلوم ہوئی تو اس واقعہ کو قطعاً ترک کر دیا ہے، اور یورپ کے اس اصول موضوعہ سے

حتّی الامکان احتراز کیا ہے کہ ایک ساتھ کے دو واقعوں میں علّت و معلول کا تعلق پیدا کر کے فرضی بنیاد پر قیاسات کی عالیشان عمارت کھڑی کر دی جائے۔

صوبہ متحدہ کے شمالی مغربی اضلاع کی مابہ الامتیاز خصوصیات میں ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ سرزمین ہمیشہ مذہبی روایات کی حامل رہی ہے ان اضلاع کے مسلمانوں میں قدیم زمانہ سے دینداری اور اتباع شریعت کا جذبہ دوسرے مقاموں سے کہیں زیادہ کارفرما رہا ہے، یہاں کے باغیرت مسلمانوں نے دین اور مذہب کے نام پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دینے کو ہمیشہ اپنا مقصد زندگی سمجھا ہے، ان اضلاع اور خصوصاً دیوبند کی سرزمین کی فضا میں قال اللہ اور قال الرسول کی آوازیں اسلام کی زندگی کا ثبوت ہیں، تبلیغ اسلام کی بیشتر تحریکوں میں ان اضلاع کے مسلمانوں نے دل کھول کر حصہ لیا ہے اور اس مبارک فرض کو انجام دینے میں وہ ہمیشہ دوسروں سے آگے رہے ہیں، غالباً اسی کا نتیجہ ہے کہ اس سرزمین کو دینی سرگرمیوں کا مرکز بننے کا شرف حاصل ہے۔

دیوبند شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے زمانہ سے لے کر اب تک ہمیشہ اہل اللہ کا گہوارہ رہا ہے، یہاں کی سرزمین میں علم اور تقدس کے لحاظ سے ایسی ایسی برگزیدہ ہستیاں آسودہ خواب ہیں جن پر اسلامی ہندوستان کو ہمیشہ فخر اور ناز رہے گا۔

آج سے ۹۰ سال قبل دنیائے اسلام کی ممتاز ترین درس گاہ دارالعلوم کے قیام نے دیوبند کی تاریخی عظمت کو چار چاند لگا دیئے، جس سے اس کی شہرت تمام دنیا میں پھیل گئی، دارالعلوم دیوبند مسلمانان ہند کی وہ مشہور و معروف درس گاہ ہے

جس نے اسلامی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام کیا ہے، اور جہاں اسلامی دماغ اس طرح پر تیار کیا جاتا ہے کہ وہ دنیا کے موجودہ ماحول میں اسلام کو پیش کر کے اس کی برتری ثابت کر سکے، یہ دینی درس گاہ جو اپنی علمی اور مذہبی روایات کے اعتبار سے ایشیا میں ایک خاص امتیاز رکھتی ہے، ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۷ء سے قائم ہے، اس سے چودہ ہزار سے زائد علماء و فضلاء فارغ ہو چکے ہیں جو تین چوتھائی صدی سے تقریباً تمام اسلامی ممالک میں مصروف عمل ہیں، بالخصوص ہندوستان و پاکستان میں تو اسلامی تعلیم کا بار بلا شرکتِ غیرے اسی درس گاہ نے اپنے کاندھوں پر اٹھایا ہوا ہے، تبلیغ و اشاعت، رشد و ہدایت، درس و تدریس، وعظ و تقریر، تصنیف و تالیف، اور فتویٰ نویسی وغیرہ دینی کاموں میں اسی درس گاہ کے فضلاء جا بجا نظر آتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ اسلامی علوم و فنون کے ایک نہایت اہم دور کی تاریخ ہے، دسویں صدی ہجری کے بعد علوم اسلامیہ کے زوال و انحطاط کے زمانہ میں صرف دارالعلوم ہی تھا جس نے علم نبوت کے چراغ کو باد مخالف کے پیہم تھپیڑوں کے باوجود روشن رکھا، اور سیاسی غلامی کی فضا میں ذہنی آزادی کو برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی، دارالعلوم دیوبند نے چین سے لے کر مراکش تک کے طالبانِ علم کو اپنی آغوش میں جذب کر کے ان کو علمی انتشار و پراگندگی کی حالت سے نکال کر اس قابل بنا دیا کہ وہ علمی حیثیت سے اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں حصہ لے سکیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی قومی بیداری میں دارالعلوم دیوبند کا بہت بڑا حصہ ہے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد مسلمان قوم پر زوال و انحطاط کی جو کیفیت طاری ہو گئی تھی اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، اس وقت قوی اندیشہ تھا کہ اس زوال کے

طوفان میں اسلامی تعلیمات اور مسلمان فنا نہ ہوجائیں، دارالعلوم نے بروقت حالات کا جائزہ لے کر اس خطرہ کا انسداد کر دیا، اور بہت جلد اس قدر مقبولیت حاصل کر لی کہ دنیائے اسلام کے ہر حصہ سے ہزاروں طلبا، دینی علوم حاصل کرنے کے لئے یہاں آنے اور دارالعلوم کی تعلیم سے فیض یاب ہونے لگے، اس کی علمی کشش نے دُور دُور سے طلبا، کو کھینچ کر اپنی آغوش میں جمع کر لیا اور مختلف رنگ و بُو کے پھولوں سے اس کا دامن پُر نظر آنے لگا،

مجھے اس امر کا افسوس ہے کہ دیوبند کی تاریخ میں مسلمانوں کی آمد سے قبل کے واقعات دستیاب نہیں ہو سکے، اور ؎

سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی
نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم!

اشاعت کی سہولت کے لئے تاریخ دیوبند کو دو جلدوں پر تقسیم کر دیا گیا ہے یہ جلد دیوبند کی تاریخ اور دارالعلوم کے حالات پر مشتمل ہے، دوسری جلد میں اکابر اولیاء اللہ علماء کرام اور مصنفین و شعراء کا تذکرہ ہوگا۔

یہ آخری حصہ انشاء اللہ آئندہ پیش کرنے کی جرأت کرونگا۔

سیّد محبوب رضوی

۲۵ محرم الحرام ۱۳۷۲ھ
۱۶ اکتوبر ۱۹۵۲ء

قدامت

دیوبند کو کب اور کس نے آباد کیا؟ اس کا فیصلہ کن جواب دینا بہت مشکل ہے، قدامت کے باعث اب تک اس کے زمانۂ تعمیر کی ٹھیک ٹھیک تعیین نہیں کی جاسکی ہے کسی نے ایک ہزار برس کی آبادی بیان کی ہے، اور کسی نے سمبت بکرما جیت سے پہلے کی جس کو دو ہزار سال سے زائد گزر چکے ہیں،

ایک روایت میں طوفان نوح کے قریب ترین زمانہ میں آباد ہونا بتلایا گیا ہے، تاہم پرانی عمارتوں اور کتبوں سے اس قدر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ابتدائی عہد حکومت کے بہت پہلے سے آباد ہے، دوآبہ کا علاقہ تاریخ کے قدیم ترین زمانہ سے ہندوستان کی تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے،

موجودہ آبادی سے مشرق کی جانب تقریباً دو میل کے فاصلہ پر پختہ عمارتوں اور غیر مسلم عبادت گاہوں کے بکثرت نشانات ملتے ہیں، پرانے لوگوں کا بیان ہے کہ ڈیڑھ دو ہزار سال قبل دیوبند کی قدیم آبادی یہی تھی، میرا خیال ہے کہ اگر اس سلسلہ میں تجسس وتحقیق اور چھان بین سے کام کیا جائے اور یہاں کے کھنڈروں کی اینٹوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا جائے تو یقیناً کچھ نہ کچھ انکشافات ہو سکتے ہیں،

دیوبند کے متعلق یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ بودھ مت کے عروج کے آخری زمانہ میں جبکہ برہمن اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو حاصل کرنے کے لئے خفیہ جد وجہد کر رہے تھے تو یہ مقام بھی اُن کے خفیہ انقلابی مرکزوں میں سے تھا،

بہرحال اس کا افسوس ہے کہ دیوبند کی قدامت کے لحاظ سے اس کے حالات

کا پتہ لگانے کے ذرائع مجھے دستیاب نہیں ہو سکے، اس لئے ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ کے طور پر جو معلومات حاصل ہو سکے، وہ پیش کئے جا رہے ہیں۔

مولانا فصیح الدین صاحبؒ اپنے جغرافیہ ضلع سہارنپور میں دیوبند کی آبادی کی نسبت لکھتے ہیں کہ

"آبادی نہایت پرانی سمبت بکرمیت سے پہلے کی ہے"

تاریخ سہارنپور کا مصنف بھی زمانۂ آبادی کی ٹھیک تعیین نہیں کر سکا، اُس نے لکھا ہے کہ

"یہ قصبہ قدیمی ہے، تخمیناً ایک ہزار برس کی آبادی بیان کرتے ہیں، ایک قلعہ بھی اس میں تھا کہ اب اس پر عمارت سابق کا نشان نہیں ہے اب مثل ایک کھیڑے کے ہے، سرکار انگریزی نے مقام تحصیل اس پر بنایا ہے، اس قلعہ کے دروازے پر ایک مسجد بہ عمارت پختہ کہنہ تعمیر موجود ہے، اور پیش دروازہ اس کے پتھر پر یہ عبارت اس کے سن و تاریخ کی کندہ ہے، ۶۱۶ھ ۱۲۱۹ء سلطان سکندر بن بہلول شاہ[۱]"

(ص ۲۶ و ۱۶۰)

مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ، دیوبند کو طوفان نوحؑ کے بعد کی ابتدائی بستیوں میں شمار کرتے ہیں، انھوں نے ذیل کے ادیبانہ انداز میں اس کی قدامت کا ذکر کیا ہے
فکورۃ قدیمۃ، وقصبۃ   یہ ایک قدیم آبادی ہے، بہت بڑا

---

[۱] تاریخ سہارنپور کے مصنف کو مسجد کے سن تعمیر کے پڑھنے میں مشہور روایت کی بنا پر غلطی ہوئی ہے، دراصل یہ مسجد ۹۱۰ھ ۱۵۰۴ء کی تعمیر ہے، اس کی تفصیل آگے آئے گی، "م"

عظيمة، ومدينة كريمة، وبلدة
فخيمة كانها اول عمران، عمر بعد
الطوفان، ذات المعاهد الوسيعة
والمساجد الرفيعة والمعالم المشهورة
والمقابر المزورة، والآثار المحمودة
والاخيار المسعودة، وأبنية
مرصوصة وامكنة مخصوصة
(الهدية السنية ص ۱۰)

قصبہ اور عظیم الشان شہر ہے، معلوم ہوتا ہے کہ طوفان نوحؑ کے بعد کی ابتدائی بستیوں میں سے ہے، اس کی عمارت اور مساجد نہایت وسیع اور بلند واقع ہوئی ہیں، آثار قدیمہ اور مزارات اولیاء اللہ سے بھرا ہوا ہے، اس کے آثار محمودہ اور حالاتِ مبارکہ مشہور ہیں، اس میں پختہ عمارات اور مستحکم عمارتیں ہیں۔

ہندی زبان کے "ہندو سنسکرت کا ایک کیندر" کے مصنف نے لکھا ہے کہ

"دیوبند کا ذکر بار کنڈے پُران میں ملتا ہے جس سے دیوبند کی قدامت ثابت ہے، نیز یہ بھی مشہور ہے کہ کوروں پانڈوں کے عہد حکومت میں دیوبند آباد تھا۔"

(ہندو سنسکرت کا ایک کیندر ص ۲ شائع کردہ نرائن نند سرستی)

شہر سے باہر جنوب کی جانب ایک محلہ سرائے پیرزادگان ہے، اس محلہ کے ایک کنویں میں سنسکرت رسم الخط کا ایک کتبہ اینٹوں پر کھدا ہوا ہے، اس کتبہ کو پڑھنے کی بے حد کوشش کی گئی، مگر اینٹوں کے گھس جانے کی وجہ سے حروف صاف طور پر معلوم نہیں ہوتے، صرف نیچے کی جانب کسی قدر سن کا پتہ چلتا ہے، غالباً ۱۱۹ سمہ بکرما جیت ہے، سو سال سے کچھ زائد ہوئے کہ تعمیر مکان کے سلسلہ میں ایک بہت پرانے بند کنویں سے ایک سنگی کتبہ برآمد ہوا تھا جس کو سکندر اعظم کے زمانہ کا بتایا جاتا ہے، اس کتبہ پر برآمدگی کے بعد ماہرین آثار قدیمہ نے قبضہ کر لیا معلوم نہیں کہ اب کہاں ہے، اگر یہ کتبہ ہاتھ آتا تو

شاید مزید انکشاف ہو سکتا تھا،

یہاں ایک قلعہ بھی راجگان ہستنا پور کے زمانہ کا بیان کیا جاتا ہے، سلطان سکندر شاہ کے عہد میں حسن خاں صوبہ دار نے قدیم عمارت کو مسمار کرا کر از سر نو پختہ اینٹوں کا تعمیر کرایا تھا، حسن خاں کے نام کی نسبت سے قلعہ کا مقام اب تک حسن گڈھ کہلاتا ہے،

اس قلعہ کے متعلق آئین اکبری میں ہے کہ

"دیوبند قلعہ از خشت پختہ دارد" (آئین اکبری جلد دوم ص ۱۴۳)

قلعہ اور اس کی عمارتوں کا اب کوئی نشان نہیں ملتا صرف ایک اونچا مقام ہے جس پر زیادہ تر سرکاری عمارتیں تحصیل، عدالت منصفی، دفتر رجسٹری، ڈاک خانہ اور اسکول بنے ہوئے ہیں۔ اس قلعہ کے ایک کنویں کے متعلق عام طور پر یہ روایت مشہور ہے کہ اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں دیوؤں کو قید کیا گیا تھا۔

قدیم آبادیوں میں ایک یہ خصوصیت عام طور پر پائی جاتی ہے کہ ان کی آبادی ہموار سطح پر واقع نہیں ہے، کہیں نشیب ہے اور کہیں فراز اس کا سبب ماہرین آثار قدیمہ (Archeology) کے نزدیک یہ ہے کہ زمانہ کے حوادثات سے جب بھی کوئی آبادی نیست و نابود ہوتی ہے تو زمین پر اپنا ارتفاعی نشان ضرور چھوڑتی ہے، بعد کے لوگ اسی جگہ آباد ہونے کی خواہش کے ماتحت اس پر دوبارہ تعمیر کرتے ہیں، اور جب یہ سلسلہ ہزاروں سال تک جاری رہتا ہے اور آبادیاں بگڑتی اور بنتی رہتی ہیں تو سطح میں ناہمواری اور نشیب و فراز کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ کے نزدیک یہ نہیں ہوتا کہ جب ابتدائی آبادی ہوئی اس وقت وہ جگہ ناہموار ہو، بلکہ یہ ایک ارتقائی امر ہوتا ہے اور اس کے لیئے ہزاروں سال کی گردش درکار ہوتی ہے۔

اس اصول کے مطابق جب دیوبند کو دیکھا جاتا ہے تو اس کی آبادی میں بکثرت نشیب و فراز نمایاں نظر آتے ہیں، اور بعض بعض جگہ تو یہ تفاوت پچاس فٹ تک پہنچ جاتا ہے

وجہ تسمیہ

دیوبند کی وجہ تسمیہ میں ذیل کی متعدد اور مختلف روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔

(۱) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دیوبند کو پہلے "دیوی بلاس" کہتے تھے کیونکہ یہاں پر سُندری دیوی کا ایک مندر معروف بہ "دیوی کنڈ" اور ایک جنگل موسوم بہ "بلاس" واقع تھے۔

(۲) پنڈت نند کشور نے ضلع سہارنپور کی تاریخ میں دیوبند کی وجہ تسمیہ کی نسبت لکھا ہے کہ

"وجہ تسمیہ قصبہ میں بہت سی روایات زباں زد ساکنین قصبہ کے ہیں، مگر قرینِ قیاس وجہ تسمیہ کے یہ معلوم ہوئی کہ پہلے اس موقع پر جنگل لق و دق تھا، ایک مکان معروف "دیوی کنڈ" اور دوسرا جنگل "بلاس" اس موقع پر واقع تھے، ان دونوں مکانوں کے سبب سے بنام نہاد دیوبند مشہور ہوا، پہلے اس مقام کو "دیبی بن" کہتے تھے، کثرت استعمال سے دیوبند ہوگیا۔"

(تاریخ سہارنپور مطبوعہ ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء ص ۲۷ و ۱۶۰)

(۳) بعض کا قول یہ ہے کہ "سلیمان پیغمبر نے اس کے قلعہ میں دیوؤں کو بند کیا ہے، اس واسطے دیوبند نام ہے، کس واسطے کہ ہندی میں "دیو" معنی "دیوتا" اور "بن" مراد جنگل سے" ہے (تاریخ سہارنپور صفحہ ۲۷ و ۱۶۰)

(۴) بعض لوگ ایران کی تاریخ کے حوالہ سے ایک اور سبب تسمیہ بیان کرتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

"ایران کے آریہ نسل کے باشندوں کی زبان میں لفظ "دیو" کا اطلاق وحشی اور جنگلی انسانوں پر کیا جاتا تھا چنانچہ یہی لفظ ہندوستان میں آکر بعد کو "مہادیو" بن گیا"

پھر ہندوستان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ

ان ہی آریہ نسلوں نے ہندوستان آکر یہاں کے اصلی باشندوں کو کھلے میدانوں اور آبادیوں سے بزور شمشیر نکال کر گنجان جنگلوں اور دشوار گذار پہاڑوں میں مار بھگایا،

پس چونکہ دیوبند میں جنگلات کی کثرت تھی قرین قیاس ہے کہ تو وارد آریوں نے وحشی اقوام کو اس جنگل میں بند کر دیا ہو"

(۵) ایک روایت (جس کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے) یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ "حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں دیوبند کے باشندوں کی فریاد پر آپ کے عمال نے یہاں آکر ایذا دہندہ دیووں کو قید کر دیا، اور دیووں کا یہ تقید آگے چل کر سبب تسمیہ بن گیا، چنانچہ اسی روایت کی بناء پر ایک بند کنویں کو دوبارہ کھودنے کے وقت ایک مہیب صورت "دیو" کا نکلنا بھی عوام الناس کے زبان زد ہے"

(مقدمہ حیات شیخ الہندؒ مصنفہ مولانا میاں اصغر حسین صاحبؒ)

تاریخی اور تحقیقی طور پر ان میں سے ہر ایک روایت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، البتہ روایات کے اختلاف سے تین ناموں کا یقین ہوتا ہے، "دیوی بلاس" - "دیوی بن" - "دیوبند" - اب دیکھنا یہ ہے کہ تاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں میں یہ مقام کس نام سے ملتا ہے، جہاں تک تلفظ کا تعلق ہے اس میں مؤخر الذکر دو نام مروج ہیں، تاریخ سے بھی ان ہی دو ناموں کا ثبوت

ملتا ہے، مگر وہ بھی بہت زیادہ قدیم نہیں، میرے اجداد میں بعض بزرگوں کے نام جہانگیر اور شاہجہاں نے جاگیریں عطا کی ہیں اُن میں دیوبندہی تحریر ہے، آئین اکبری جو عہد اکبری کی تصنیف ہے اس میں بھی دیوبندہی لکھا گیا ہے۔

(ملاحظہ ہو آئین اکبری جلد دوم مطبوعہ نول کشور ۱۸۹۳ء ص ۱۴۲، ۳۲۸)

کتب خانہ دار العلوم دیوبند میں زیج اُلغ بیگی کا ایک مخطوطہ ہے اس کے اخیر میں تحریر ہے۔

"ایں اوراق زیج اُلغ بیگی در روز یوم السبت در قلعۂ دیوبند بتاریخ نوزدہم شہر ربیع الاول ۱۱۹۸ھ ۱۷۸۴ء صورت تحریر یافت"

دیوبند میں ایک بزرگ "قالو قلندر" گذرے ہیں، جن کا مزار تحصیل کے قریب سبزی فروشوں کے بازار میں واقع ہے، تذکرۃ العابدین صفحہ ۲۷۹ پر ان کا سن وفات ۸۲۵ھ ۱۴۲۱ء لکھا ہے ان قالو قلندر رح کا ایک شعر عام طور پر زبان زد ہے جس میں دیوبند ہی نظم کیا گیا ہے اس شعر کا پہلا مصرعہ یہ ہے ع

قالو قلندر ست بدروازہ دیوبند

مجدد الف ثانی رح کی سیرت زبدۃ المقامات جو اوائل گیارہویں صدی ہجری کی تصنیف ہے اس میں ایک مکتوب بنام شیخ احمد دیبنی رح کے ذیل میں تحریر ہے۔

"دیبن موضعی ست از مضافات سہارنپور میان دو آب" (مطبوعہ محمود پریس لکھنؤ ص ۳۶۲)

۱۳۰۱ھ ۱۸۸۴ء میں دیوبند میں ایک زبردست پلیگ پھیلا تھا، اس پلیگ کی تباہ کاریوں کو مولانا فضل الرحمن صاحب رح نے فارسی میں نظم کیا ہے، اس نظم کا تاریخی نام "قصہ غم دیبن" ہے،

۱۳۲۲ھ (۱۹۰۵ء) میں جیمس ڈکس لاٹوش لفٹینٹ گورنر صوبہ متحدہ کے معائنہ دارالعلوم دیوبند کے خیر مقدم میں جو نظم پڑھی گئی اس میں بھی "دیبن" نظم کیا گیا ہے، شعر یہ ہے ؎

ہے یہ دارالعلم شاہا! یادگارِ مسلمیں ۔۔۔ کورده دیبن سا جس سے رشکِ شہر طوس ہو

مذکورہ بالا تحریری اسناد سے یہ واضح ہوتا ہے کہ "دیبن" اور "دیوبند" دونوں نام مدت مدید سے مروج اور زبان زد ہیں اس لئے قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں اولیّت کس کو حاصل ہے، تاہم میرے نزدیک وجہ تسمیہ کی پہلی دو روایتیں عقل اور قیاس کے اعتبار سے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہیں کہ دیوبند "دیوی" اور "بن" سے مرکب ہے، ان دونوں لفظوں کی آمیزش نے اس کو اولاً "دیوی بن" سے موسوم کرایا جو بعد ازاں کثرت استعمال سے "دِے بَن" اور پھر رفتہ رفتہ تصرفِ متکلمین سے دیوبند ہو گیا، اس روایت کے آثار و قرائن بھی فی الجملہ پائے جاتے ہیں، یعنی "دیوی" کا مندر اور "بن"۔ گو ان میں سے آخری چیز ختم ہوتے ہوتے اب قریب قریب معدوم ہو چکی ہے مگر اس کے وجود کا ثبوت وجہ تسمیہ کے علاوہ، متعدد روایات کے سبب سے "خبر متواتر" کی حیثیت رکھتا ہے، نیز دیوبند کے شمالی جانب کا ایک مقام، "قاضی فضل اللہ شہیدؒ کی بنی" کے نام سے موسوم ہو گیا ہے، جو اسی بن کا ایک حصہ ہونے کی وجہ سے بصیغۂ تصغیر "بنی" کہلاتا ہے، اس "بنی" کے کچھ کچھ آثار اب بھی باقی رہ گئے ہیں۔

محلِ وقوع

دیوبند شمالی ہند میں ۲۹ درجہ ۵۸ دقیقہ عرض البلد اور ۷۷ درجہ ۳۵ دقیقہ طول البلد پر دہلی سے ۱۰۹ میل شمال کی جانب ضلع سہارنپور میں ایسٹرن پنجاب ریلوے

پر واقع ہے؛

دیوبند کے شمال میں سہارنپور، جنوب میں مظفر نگر، مشرق میں بجنور اور مغرب میں کرنال ہے، اس کے شرق میں دریائے گنگا بہتا ہے اور مغرب میں دریائے جمنا، دیوبند ان دونوں مشہور دریاؤں کے وسط میں واقع ہے۔

شیر شاہ سوری کی وہ شاہ راہ اعظم جو کلکتہ سے پشاور تک پھیلی ہوئی ہے دیوبند سے گذرتی ہے یہ وہی شاہی سڑک ہے جس کی تعریف خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنے مسدس کے اس بند میں کی ہے، ؎

یہ ہموار سڑکیں، یہ راہیں مصفا دو طرفہ برابر درختوں کا سایا
نشاں جابجا میل و فرسخ کے برپا سرِ رہ کنوئیں اور سرائیں مہیّا

واقعہ یہ ہے کہ شیر شاہ کا یہ تعمیری کارنامہ اپنے زمانہ کے لحاظ سے بالکل عدیم المثال ہے، یہ سڑک چار مہینے کی مسافت پر پھیلی ہوئی تھی، سات سات کوس کے فاصلہ پر پختہ سرائیں بنوائی تھیں، مسافروں کو آرام پہنچانے کے لئے ان میں ہندو اور مسلمان نوکر رکھے گئے تھے، سڑک کے دونوں جانب میوہ دار درخت لگوائے تھے، جن کے پھل مسافروں کے کام آتے تھے، راستہ کے اندازہ کے لئے ہر کوس پر منارہ بنا ہوتا تھا، سڑک پر جابجا کوئیں اور مسجدیں تھیں، مسجدوں میں سرکاری امام اور مؤذن مقرر تھے، غرضکہ اس زمانہ کے لحاظ سے مسافروں کو سفر میں جن چیزوں کی ضرورت پیش آتی تھی ان سب کا انتظام حکومت کی جانب سے مفت کیا جاتا تھا۔

دیوبند میں بھی اس قسم کی سرائے کے آثار اور نشانات سڑک کے متصل موجود ہیں مظفر نگر اور سہارنپور کے درمیان کا ٹکڑا اب تک پختہ نہیں تھا۔ اب چند

سالوں سے اس سڑک کی تعمیر کا کام جاری ہے، ابتدائی کام مکمل ہوچکا ہے صرف سیمنٹ بچھانا باقی ہے، امید ہے کہ عنقریب ہی اس کی تکمیل بھی ہوجائے گی۔

اس سڑک کے علاوہ نارتھ ولیسٹرن ریلوے کی وہ مین لائن بھی دیوبند سے گذرتی ہے۔ جو دہلی سے سہارنپور ہوتی ہوئی پشاور تک جاتی تھی تقسیم ملک کے بعد اب یہ لائن ایسٹرن پنجاب ریلوے کے نام سے موسوم کر دی گئی ہے، اور پشاور کے بجائے اب امرت سر تک جاتی ہے یہ ریلوے لائن ۱۲۸۵ھ ۱۸۶۸ء میں تعمیر ہوئی تھی، اور یکم جنوری ۱۸۶۹ء ۱۲۸۶ھ سے اس پر گاڑیاں چل رہی ہیں۔ (تاریخ سہارنپور ص ۲۸)

آبادی کا طرز

دیوبند کی آبادی کا طرز بھی قابل ذکر ہے جس کی نظیر بہت کم دوسری جگہ ملے گی یہاں کی آبادی کی تقسیم اس طرح پر ہے کہ ایک جانب مسلمان آباد ہیں اور دوسری طرف ہندو، درمیان میں شمالاً جنوباً ایک بازار ہے جو بمنزلہ حد فاصل کے ہے، بازار کی جانب مغرب مسلمان آباد ہیں اور دوسری جانب مشرق میں ہندو، پھر مسلمان اور ہندوؤں میں ہر ایک قوم علیحدہ علیحدہ اور ایک جگہ آباد ہے، اگرچہ امتداد زمانہ اور نقل وتبدیل سے اب یہ حالت بہت کچھ بدل گئی ہے تاہم یہ ترتیب ابھی تک ظاہر اور محسوس ہوتی ہے، قوموں اور محلوں کی یہ ترتیب وتقسیم سلطان شہاب الدین غوری کے عہد کی یادگار بتلائی جاتی ہے (تاریخ سہارنپور۔ ص ۱۶۱)

موجودہ آبادی ۳۶ محلوں پر منقسم ہے، ستمبر ۱۹۴۶ء کے راشننگ سسٹم کے اعداد و شمار کے مطابق مکانوں کی تعداد ۵,۴۰۶ ہے۔

مختلف حکومتوں کا تصرف

تاریخ سہارنپور کی روایت کے بموجب یہ علاقہ جس میں دیوبند واقع ہے قدیم زمانہ میں "مس کا دیش" کے نام سے موسوم تھا، شمالی ہند کے راجگان کا دار السلطنت جب تک ہستنا پور (ضلع میرٹھ) رہا یہ علاقہ اس کے ماتحت رہا، بعد ازاں اندر پرست (دہلی) کے مہاراجگان کی زیر حکومت شمار کیا جاتا رہا، گویا کہ ابتدائے آبادی سے بارہویں صدی عیسوی تک آرین اور ہندو اس پر قابض اور حکمراں رہے۔

۵۸۹ھ / ۱۱۹۳ء میں سلطان شہاب الدین غوری کی فتح دہلی کے بعد مسلمانوں کے تصرف میں آیا اور چھ سو سال تک اسلامی حکومت کے ماتحت رہا، اٹھارہویں صدی کے اواخر میں مغل شاہنشاہوں کی غفلت اور کمزوری کے باعث روہیلہ سردار نواب نجیب الدولہ نے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا، نواب نجیب الدولہ سے مہاراجہ سندھیا کے قبضہ میں آیا جس سے انگریزی جنرل لیک نے چھین کر دسمبر ۱۸۰۳ء / ۱۲۱۸ھ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں شامل کر دیا۔ کمپنی سے ۱۸۵۷ء میں برطانوی شہنشاہیت کی تحویل میں چلا گیا۔

اب ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے برطانوی اقتدار کے خاتمہ پر انڈین یونین میں آزاد ہندوستان کا ایک جزء ہے۔

مسلمانوں کی آمد اور آبادی میں توسیع

دیوبند میں مسلمانوں کی آمد کے زمانہ کی صحیح تعین بہت مشکل ہے، تاریخ ضلع

سہارنپور میں دیوبند میں مسلمانوں کی آمد کے سلسلہ میں ذیل کی عجیب روایت بیان کی گئی ہے۔ اگرچہ اس روایت کے بعض حصے غور طلب اور تاریخی نقطۂ نظر سے ناقابلِ یقین ہیں تاہم چونکہ اس روایت سے بعض مفید معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں اس لئے اس کو بعینہٖ نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، لکھا ہے کہ

"محمود غزنوی کا گزر جب اس طرف ہوا تب اس نے بھی اس قصبہ کی آبادی میں کوشش کی۔ وجہ کوشش کی یہ بیان کرتے ہیں کہ جس جگہ خیمہ بادشاہ کا نصب ہوا تھا، اس جگہ اتفاقاً زمین میں ایک حجرہ برآمد ہوا جس میں ایک فقیر نہایت ضعیف بیٹھا ہوا تھا، اس فقیر نے بادشاہ کو اسکی آبادی کے واسطے ہدایت کی، جب آبادی قصبہ کی زیادہ ہونے لگی تب برہمن۔ گوجر اور مسلمان کثرت سے آباد ہوئے، لیکن جنگل کی کثرت اور جھیل کے حائل ہونے سے جو قصبہ کے شمال و مغرب میں تھی اور اب آبادی میں آگئی ہے، مگر نشیب و فراز اس کا نمودار ہے، قزاقوں نے اپنا مسکن اختیار کر کے تاخت و تاراج کرنا شروع کیا، بعدہٗ شہاب الدین غوری بادشاہ کے عہد میں مرزا انور بیگ و حسن بیگ اور حیات بیگ قوم مغل بیگی ولایت سے آ کے بحکم بادشاہ مذکور اس قصبہ میں آباد ہوئے اور قزاقوں کو قتل اور گرفتار کر کے بادشاہ کے حضور میں لے گئے۔ روایت یہ ہے کہ وہ قزاق قوم مہاجن سے تھے، اولاد ان کی اب تک دیوبند میں موجود ہے، قزاقوں نے بادشاہ کے حضور میں غارت گری سے عہد کیا اور سکونت کے خواستگار ہوئے، بادشاہ نے ایک موضع نور پور متصل قصبہ دیوبند واسطے سکونت کے عطا کیا۔ اس وقت نور پور دیوبند

میں شامل ہو کر بخوبی آباد ہوا۔ اور زمینداری موضع نور پور اور چہارم قصبہ دیوبند مہاجان مذکور کے مقرر ہوئی، اور گوجر جو آباد تھے بباعث کاشت کے زمینداری میں شریک ہوئے، اور مسلمان شیخ زادہا اور ہنود نے اپنے اپنے محلے تجویز کر کے بود و باش اختیار کی، گوجر اکبر بادشاہ کے عہد میں مسلمان ہو گئے۔ اور انھوں نے بھی اپنا ایک علیحدہ محلہ تجویز کر لیا۔" (تاریخ سہارنپور ص ۱۶۰ و ۱۶۱)

دیوبند کے معلوم بزرگوں میں مندرجہ ذیل مزارات سب سے زیادہ قدیم سمجھے جاتے ہیں۔

شیخ علاء الدین مشہور بشاہ جنگل باش، یہ بزرگ محدث ابن جوزیؒ کے شاگرد اور شیخ شہاب الدین سہروردؒ کے خلیفہ ہیں، شیخ سعدی شیرازیؒ اُن کے ہم درس اور خواجہ تاش تھے۔

ایک روایت ہے کہ شیخ سعدی شیرازیؒ نے سیاحتِ ہند کے دوران میں انہی بزرگ کی ملاقات کے لئے دیوبند ورود فرمایا تھا، بوستاں کے آخر میں سومنات کے مندر سے واپسی پر خود شیخ نے ہندوستان سے گذرنے کا ذکر کیا ہے، لکھا ہے کہ ؎

بہند آمدم بعد ازاں رستخیز ۔۔۔ وزانجا براہ یمن تا حجیز

شاہ جنگل باشؒ نے ۶۶۲ھ ۱۲۶۴ء میں وفات پائی، دیوی کنڈ کے قریب ان کا مزار ہے (تذکرۃ العابدین ص ۲۶۴)

شیخ شہاب الدین بخاری مشہور بشاہ ولایتؒ نے جن کو شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی سے شرفِ بیعت حاصل تھا، ۷۸۰ھ ۱۳۷۸ء میں وفات پائی۔ دارالعلوم کے جنوبی گوشہ میں مزار پُرانوار ہے۔ (تذکرۃ العابدین ص ۲۵۱)

قالو قلندر کا سن وفات ۸۲۵ھ/۱۴۲۱ء ہے، ان کا مزار تحصیل کے قریب آبادی میں ہے ان کا ایک شعر زبان زد ہے ؎

قالو قلندر مست بدروازہ دیوبند آئندگانِ رحمت و باشندگانِ رنج

چوتھا مزار شیخ معز الاسلام کا ہے، صدیقی شیوخ کا سلسلۂ نسب دیوبند میں اُن ہی سے چلا ہے، اُن کے متعلق صرف اتنا معلوم ہے کہ شیخ بہاؤالدین ذکریا ملتانی ؒ کے شرف صحبت سے مستفیض تھے۔ شیخ بہاؤالدین ؒ نے باختلاف روایت ۶۶۱ھ/۱۲۶۲ء یا ۶۶۶ھ/۱۲۶۷ء میں وفات پائی۔ اس لحاظ سے شیخ معزالاسلام کو ساتویں صدی ہجری کے آخر میں سمجھنا چاہیئے، ان کا مزار محلہ بڑے بھائیان میں آدینی مسجد کے قریب تبلایا جاتا ہے۔

پانچویں بزرگ خواجہ ابوالوفاء عثمانی ہیں، ان کے زمانہ وفات کا بھی پتہ نہیں چلتا، صرف اس قدر سراغ ملتا ہے کہ خواجہ صاحب، شیخ جلال الدین کبیر الاولیا، پانی پتی ؒ کے ابن عم ہیں، حضرت کبیر الاولیا ؒ کا زمانۂ وفات ۷۶۵ھ/۱۳۶۳ء ہے، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ شیخ ابوالوفاؒ دیوبند میں آٹھویں صدی ہجری کے کسی حصہ میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔ محلہ محل میں انکا مزار ہے۔

شیخ ابوالوفاؒ کی اولاد میں اللہ نے بڑی برکت دی، دیوبند کے تمام عثمانی شیوخ ان ہی کی اولاد میں ہیں، شیخ ابوالوفاء کا سلسلۂ نسب یہ ہے

محمد ابوالوفاء بن عبداللہ بن حسین بن عبدالرزاق بن عبدالحکیم بن حسن بن عبداللہ عرف ضیاءالدین بن یعقوب عرف معزالدین بن عیسیٰ بن اسمٰعیل بن محمد بن ابوبکر بن علی بن عثمان بن عبداللہ حرمانی بن عبدالرحمٰن گازرونی[۱] بن

---

[۱] شیخ عبدالرحمٰن گازرونی کی اولاد کا ایک سلسلہ اودھ کے مشہور مردم خیز قصبہ بلگرام میں بھی موجود ہے
(باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

عبدالعزیز ثالث بن خالد بن ولید بن عبدالعزیز ثانی بن شہاب الدین المعروف
عبدالرحمن اکبر بن عبداللہ ثانی بن عبدالعزیز بن عبداللہ الکبیر بن عمرو بن امیرالمومنین
حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔ لے

شیخ عبدالرحمن اکبر جو حضرت عثمانؓ کی چھٹی پشت میں ہیں حسب روایت اقتباس الانوار مدینہ منورہ سے ترک وطن کرکے گازرون علاقہ ماوراء النہر میں سکونت پذیر ہوئے، ان کی تیرھویں پشت میں شیخ ابوالوفار دیوبند آئے اور یہیں مقیم ہوگئے۔

دسویں صدی ہجری کے اوائل میں جونپور کے خود مختار فرماں روا سلطان حسین مشرقی کے غالباً بھائی حسن خاں دہلی کے لودہی حکمرانوں کی جانب سے دیوبند کے حاکم بناکر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) قاضی زادگان بلگرام ان ہی کی نسل سے ہیں۔ ۱۲ م
(ملاحظہ ہو عیون المعارف مؤلفہ محمد عالم قیصری ص ۱۲)

لے یہ نسب نامہ مولانا فضل الرحمن عثمانیؒ کے شجرہ سے منقول ہے۔ تذکرۃ العابدین میں بھی شیخ ابوالوفار کا نسب نامہ مرقوم ہے، مگر اس میں عبدالحکیم بن حسن کے بعد سے علی بن عثمان تک ۸ پشتیں درج نہیں ہیں اس شجرہ کے لحاظ سے حضرت عثمانؓ سے شیخ ابوالوفار تک ۱۸ پشتیں ہوتی ہیں، اور مولانا فضل الرحمن صاحبؒ کے شجرہ کی رو سے ۲۶ نسابین کے اصول موضوعہ کے مطابق ایک صدی میں تین پشتیں ہونی چاہئیں، شیخ ابوالوفا چونکہ آٹھویں صدی کے بزرگ ہیں اس لئے ۸ صدیوں میں ۲۴ پشتیں ہونا لازمی ہے، البتہ ایک دو پشتوں کی کمی بیشی لائق اعتنا نہیں سمجھی جاتی، اس اصول کے مطابق تذکرۃ العابدین کا شجرہ جس میں ۱۸ پشتیں مذکور ہیں صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ۱۲
"م"

بھیجے گئے، حسن خاں نے ایک پختہ قلعہ تعمیر کرایا اور حسن گڈھ نام رکھا حسن خان غالباً پٹھان تھے، چنانچہ قلعہ کے اطراف میں آج بھی پٹھانوں ہی کے مکانات ہیں، حسن گڈھ کے علاوہ اسی کے متصل پٹھانوں کا ایک اور محلہ پٹھانپورہ کے نام سے بھی موسوم ہے۔

گیارہویں صدی ہجری کے اوائل میں سادات کے ایک خاندان کا اضافہ ہوا، اس خاندان کے مورث اعلیٰ کا نام سید محمد ابراہیم (قدس اللہ سرہٗ) تھا، ان کی وفات ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء میں ہوئی، دیوبند اور اس کے اطراف وجوانب میں دعوت وتبلیغ کا کام سب سے پہلے اسی بزرگ ہستی کی ذات سے انجام پذیر ہوا، اور بہت سے افراد ان کے ہاتھ پر شرفِ اسلام سے بہرہ اندوز ہوئے، سید صاحب کی خانقاہ میں دعوت وتبلیغ کے علاوہ تعلیم وتدریس اور تذکیر وتزکیہ کا سلسلہ بھی خاصے اچھے پیمانہ پر جاری تھا، دین کی ان خدمات سے جو محض حسبۃً للہ انجام دی جارہی تھیں، دہلی کی حکومت بھی باخبر تھی۔ چنانچہ اس نے متعدد مرتبہ مختلف اوقات میں سید صاحبؒ کے اخلاف کو وظائف اور جاگیریں عنایت کیں، عطایا کا سلسلہ شہنشاہ جہانگیر سے شروع ہوکر محمد شاہ اور نواب نجیب الدولہ پر ختم ہوتا ہے، شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کے جو پروانے موجود ہیں ان میں سید صاحبؒ کے اخلاف کو جاگیر دینے کا یہ سبب بیان کیا گیا ہے

"دریں ولا شیخ وجیہ الدین کہ بصلاح وتقویٰ آراستہ لیاقت تمام دارد وبجائے پدر خود در خانقاہ بتدریس وتذکیر باجماعت طالب علمان وفقراء وصوفیاء مشغول ست"

دیوبند میں علم کی غالباً یہ اولین شعاع تھی جس کو گیارہویں صدی ہجری میں حضرت الحاج سید محمد ابراہیمؒ کے مبارک ہاتھوں نے روشن کیا تھا۔ دیوبند کی تاریخ میں

اس سے قبل علم کی روشنی کا سراغ نہیں ملتا، مشہور روایت ہے کہ حضرت سید احمد شہید قدس اللہ سرہٗ ایک مرتبہ دیوبند تشریف لائے تو فرمایا کہ

"یہاں سے علم نبوت کی بُو آتی ہے"

سید شہیدؒ کے اس مقولہ کو دار العلوم کی نسبت بطور مکاشفہ و پیش گوئی کے سمجھا جاتا ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ جس "بُو" کو سید شہیدؒ نے محسوس فرمایا تھا وہ اسی گلدستۂ علم کی "بُو" تھی!

سید محمد ابراہیمؒ کے دادا شاہ محمود قلندرؒ شہنشاہ بابر کے زمانہ میں عرب سے ہندوستان آئے یہ ایک مرتاض صوفی تھے، لکھنؤ میں اقامت گزیں ہوئے، ان کا مختصر تذکرہ ملا عبد القادر بدایونی نے یہ لکھا ہے۔

"شیخ محمود قلندر لکھنوئیؒ از خلفائے شیخ محمد غوثؒ ست، صاحبِ دعوات و اسمار بود، در ریاضت و فقر و توکل شانی داشت و صاحبِ بذل و ایثار بود در لکھنؤ آمدہ بود و خیلے از مردم شرف صحبت او دریافتہ، رتبۂ ارشاد یافتند۔"

(منتخب التواریخ ص ۲۸۶)

سید محمد ابراہیم قدس سرہٗ کا سلسلۂ نسب ۴۳ واسطوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے

سید محمد ابراہیم بن شاہ سید فضل اللہ بن سید محمود قلندر بن سید احمد بن سید فرزند علی بن وجیہ الدین بن علاؤ الدین بن سید احمد کبیر بن شہاب الدین بن حسین علی بن عبد الباسط بن ابو العباس بن اسحاق عندلیب المکی بن حسین علی ہادی القاری بن لطف اللہ بن تاج الدین بن حسین بن علاؤ الدین بن ابی طالب

ابن ناصر الدین احمد بن نظام الدین حسین بن موسیٰ بن محمد الاعرج بن ابی عبد اللہ احمد بن موسیٰ المبرقع بن امام محمد تقی بن امام موسیٰ علی رضا، بن امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام زین العابدین بن امام ابی عبد اللہ الحسین بن سیدۃ النساء فاطمہ زہرہ رضی اللہ عنہا بنت سرور کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ان خاندانوں کے علاوہ اور بھی متعدد خاندان ہیں جو مختلف زمانوں میں دیوبند آکر آباد ہوئے ان کی تفصیل آئندہ کسی مقام پر آئے گی۔

۱۸۵۷ء سے قبل و مابعد قزاقانہ حملے

اٹھارھویں صدی عیسوی کے وسط (بارہویں صدی ہجری کے اواخر) میں پنجاب کے سکھوں کا یہ معمول ہوگیا تھا کہ برسات ختم ہوجانے پر دریائے جمنا کو عبور کرکے دوآبہ میں تاخت وتاراج کیا کرتے تھے، سکھوں کی یہ مسلح جماعت ان کی اصطلاح میں "دَل" کہلاتی تھی،

سنہ ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء میں سردار غریب سنگھ نے ضلع سہارنپور اور مظفر نگر کے اکثر متمول گاؤں میں لوٹ مار کی، سنہ ۱۱۸۰ھ/۱۷۶۶ء میں قصبہ تھانہ بھون اور سنہ ۱۱۸۴ھ/۱۷۷۰ء میں مظفر نگر کو لوٹا، سنہ ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء میں سکھوں کی ایک بڑی جمعیت جو ایک لاکھ سوار اور پیادوں پر مشتمل تھی دیوبند پر حملہ آور ہوئی، لوٹ مار، قتل وقتال اور آتش زدگی کا اتنا بڑا حادثہ دیوبند میں اب تک کبھی پیش نہیں آیا، اس ہنگامہ میں یہاں کا سرکاری حاکم سکھوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا جن لوگوں نے مزاحمت کی سکھوں نے قابو پاکر ان سے شدید انتقام لیا اور متعدد محلوں

کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا، اس حادثۂ عظیم کی جو تفصیلات ایک پرانی دستاویز میں بیان کی گئی ہیں ان کو پڑھکر دل لرز اٹھتا ہے، یہ دستاویز ایک درخواست ہے جو ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں جبکہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم ہو چکی تھی سہارنپور کی کلکٹری میں پیش کی گئی تھی، درخواست میں لکھا ہے کہ۔

"احوال حادثات تاخت و تاراج و غارت گری و سوختگی قصبہ مسکن ماسائلون از زیادتی تعدی زمرہ سکھان بدمآل از شوامت قسمت مسکن ماسائلون کرۃً بعد اولیٰ و مرۃً بعد اخریٰ بر جمیع صغار و کبار ایں دیار ہویدا و آشکارہ خصوصاً ایں دفعہ اخریٰ کہ بتاریخ نہم شہر ربیع الاول سنہ ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء ہجری کھٹیک سنگہ و مادھو سنگہ و چیت سنگہ و تارا سنگہ و کھنڈا و غیرہ بجمعیت یک لکھ سوار و پیادہ از مقام قصبہ اندری[1] کہ تخمیناً مفاصلۂ چہل کروہ[2] خواہد بود شباشب باختہ محاصرہ مسکین ماسائلون شدہ بغارتے و سوختگی اماکن و مساکن ماسائلون پرداختہ ہیچ اشیاء از قسم کواغذ و زیور و ظروف وغیرہ بخانہ ہیچک از ما

---

[1] اندری کا محل وقوع ماوراء جمنا مشرقی پنجاب کے ضلع کرنال میں ہے اب اس کی حیثیت محض ایک گاؤں کی ہے، عہد اکبری میں یہ ایک بڑا اور پر رونق قصبہ تھا۔ ۱۲ "م"

[2] کروہ (بہر دو پیش) کے فاصلہ میں اختلاف ہے، بعض اس کی مسافت چار ہزار گز بتلاتے ہیں اور بعض بقدر ایک میل (۱۷۶۰ گز) کے چنانچہ نفائس اللغات مصنفہ اوحد الدین بلگرامی میں لفظ "کوس" کے تحت میں لکھا ہے،

"بمعنی ثلث فرسخ یعنی یک فرسنگ بعربی آں را "میل" بکسر میم گویند "امیال" بالفتح و "میول" بالضم جمع آں، فارسی کروہ گویند و نیز سنگے را گویند کہ برائے علامت تمام شدن، کروہ بر سر راہ ہا نصب کنند" ۱۲ "م"

باشندگان قصبہ ما سائلوں نگذاشتہ تا ہیچ دہ یوم قیام ورزیدہ بخاطر جمع تمام از نقود و عروض اثاث البیوت خانہ روبی کردہ کوچیدہ رفتند برون رخت ادبار آں مقاہیر نابکار بشہر سوختہ خود ہا داخل شدہ بعد الفراغ تجہیز و تکفین مقتولان و انقضائے مکانات آتش زدہ بتوقع یافتگی کواغذ وغیرہ واسناد عزیز تر از ہمہ اثاث البیوت ہر چند تجسس و تلاش نمودیم اصلاً از اں اثرے ونشانے نہ یافتہ محروم و مضطرب ماندند ۔"

۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۴ء میں رائے سنگھ اور شیر سنگھ دو سکھ سرداروں نے قلعہ احمد آباد واقع سہارنپور کا جو برطانوی زمانۂ حکومت میں جیل خانہ بنادیا گیا ہے، محاصرہ کرلیا اور انگریزی فوجی کیمپ کو آگ لگادی، مسٹر گیتھلی جو اس وقت سہارنپور کا کلکٹر تھا، قلعہ میں محصور ہوگیا اور قریب تھا کہ وہ سکھوں کے آگے ہتھیار ڈال دے مگر عین وقت پر سردھنہ کی بیگم شمرو اور کرنل برن فوج لیکر پہنچ گئے، انگریزی کمک سے خوف زدہ ہوکر سکھ بھاگ نکلے، کرنل برن نے تعاقب کیا اور دیوبند کے قریب ہنڈن ندی پر سکھوں کو زبردست شکست دی، ان کے اکثر سردار مارے گئے، اس جنگ کے بعد پھر کبھی سکھوں کو دوآبہ پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ (تاریخ سہارنپور ص ۶۲ و ۶۳)

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ اور بدنظمی کے زمانہ میں ایک مرتبہ دیوبند کے قرب وجوار کے جرائم پیشہ دیہات جو کاٹھ کے نام سے موسوم ہیں دیوبند پر چڑھ آئے، اس زمانہ میں ہندوؤں کے سربرآوردہ رئیس پنڈت بھگوان سنگھ مصر تھے جن کے پاس مسلح سپاہیوں کی کافی تعداد تھی، کاٹھیوں نے پنڈت جی کے مکان پر حملہ کیا، ان کے سپاہی حملہ کی تاب نہ لاسکے، خود پنڈت جی کو اس معرکہ میں شدید زخم پہنچے، کاٹھیوں نے مکان میں داخل ہوکر

تمام نقد وجنس لوٹ لیا، اور انتہا یہ کہ پنڈت جی کے ناموس پر بھی دست درازی کرنی چاہی۔ مسلمانوں نے اس زمانہ میں اپنی حفاظت کا معقول انتظام کیا ہوا تھا، ان کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ کاٹھیوں پر ٹوٹ پڑے اور ایسا زبردست حملہ کیا کہ ان میں سے بہت کم لوگ اپنی جانیں بچانے میں کامیاب ہو سکے، وہ حواس باختہ ہو کر جدھر بھاگتے، مارے جاتے تھے، مشہور ہے کہ اس موقع پر اس قدر خوں ریزی ہوئی کہ نالیوں میں پانی کی طرح خون بہہ رہا تھا۔ یہ واقعہ ۱۵ر جولائی ۱۸۵۷ء مطابق ۱۲۷۴ھ کا ہے۔

راقم السطور نے اس واقعہ کو ایسے لوگوں سے سُنا ہے جو اس ہنگامہ میں بذات خود شریک تھے، علاوہ ازیں تاریخ سہارنپور سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، مگر اس میں تفصیلات نہیں ہیں، صرف حملہ اور مسلمانوں کے مقابلہ کا مجملاً ذکر ہے۔

سعی آزادی کے شرکاء کو سزائیں

۱۸۵۷ء کی سعی آزادی میں حصہ لینے والوں کو بدقسمتی سے جب ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا اور تیموری سلطنت کا آخری چراغ بھی ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا تو ہر وہ شخص جس نے آزادیٔ وطن کی تحریک میں کوئی حصہ لیا تھا، برطانوی حکومت کا باغی[1] اور مجرم

---

[1] ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے لئے ہم سب کی زبانوں پر عام طور سے لفظ "غدر" بولا جاتا ہے، یہ لفظ حقیقت سے کس قدر دور ہے اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے اس تحریک کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے، مجھے یہاں صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ اس لفظ کی عمومیت کا کیا سبب ہے؟ اس تحریک کے خلاف جو ہندوستان کے لوگوں کا قطعی جائز حق تھا، انگریزوں نے ہندوستانیوں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

قرار پایا، انگریزوں نے غلبہ حاصل کرنے کے بعد جس شد و مد سے پورے ملک سے اس کا انتقام لیا اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے صرف دیوبند میں ۴۴-اشخاص کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا، ۱۶-آدمیوں کو دس دس سال قید اور بیس کو تین تین سال کی سزا دی گئی، ۴۲-اشخاص پر جرمانہ عائد کیا گیا اور اسی قدر افراد سے پُرامن رہنے کی ضمانت لی گئی، سات انسان ایسے خوش قسمت تھے کہ صرف سزائے بید دے کر چھوڑ دیئے گئے، مضافات کے تین گاؤں نذر آتش کر دیئے گئے، بہت سے لوگوں کی معافی دوام جاگیریں ضبط کر لی گئیں۔

(تاریخ سہارنپور ص ۲۶۶،۲۶۷ و ۱۶۱)

عام حالات

ملکی اور عدالتی حیثیت

جہاں تک تاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں سے معلوم ہو سکا ہے وہ یہ ہے کہ دیوبند کی سیاسی حیثیت موجودہ نوعیت

کے مظالم اور اپنی معصومیت و مظلومیت کی داستان کو کچھ اس طرح دنیا کے سامنے پیش کیا اور پروپیگنڈے کا ایسا مؤثر انداز اختیار کیا کہ ہم خود فریب خوردہ ہو کر ان کے ہم نوا بن گئے! اگر اپنی حکومت کے تحفظ و بقا، اور غیر ملکی اقتدار کے دفاع کے لئے برسر پیکار ہونے کا نام "غدر" ہو سکتا ہے تو آزادی کی اس تحریک کو "غدر" کہنا بے جا نہ ہوگا، اور اگر دنیا کے قوانین میں شہری آزادی اور بقائے حکومت کی سعی و کوشش کوئی مذموم فعل نہیں ہے تو ہندوستان کے لوگوں پر "غدر" کا الزام لگانا بلاشبہ ان کے جذبۂ آزادی کی انتہائی توہین و تذلیل کا موجب ہے اور ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا دامن اخلاق اس قسم کے دھبوں سے قطعاً پاک ہے جیسا کہ ایک امریکن مصنف "ایڈورڈ ٹامسن" نے اپنی کتاب "دی ادھر سائڈ آف دی میڈل" میں اس کا اعتراف کیا ہے، ۱۲ م

کے لحاظ سے ضلع کے تحت تحصیل کی رہی ہے، عہد اکبری میں ضلع سہارنپور چار دستور اور چھتیس محال پر منقسم تھا جس کی تفصیل یہ تھی۔

سہارنپور، دیوبند، ملہی پور، بہت، کھنجاور، ہنگور، نانوتہ، رامپور، سرورٹ، پور چھپار، جوراسی، کیری کہرنزی، سرساوہ، چرتھاول، رڑکی، بگھرا، تھانہ بھیم، مظفر آباد، رائے پور تاتار پور، ابیٹھ، بھوگ پور، بہٹ، سنبلہیڑا، کھوڈی، گنگوہ، تغلق پور، لکھنوتی،"

برطانوی حکومت کے عہد میں بسنہ ۱۸۳۴ء / ۱۲۵۰ھ کے بندوبست میں سہارنپور کے تحت دیوبند کو تحصیل مقرر کر کے اس کے تحت چار پرگنے دیوبند، ناگل، رامپور، اور نانوتہ قائم کر دئے گئے ہیں۔

عہدِ اکبری میں تحصیل دیوبند کی سالانہ مال گذاری ۶۴،۷۷،۹۷۷ دام[۱] تھی۔ یعنی موجودہ حساب سے ۱،۶۱،۹۴۹ روپے، ۱۷ دام،

موجودہ عہد میں مال گذاری ۴،۶۷،۷۵۲ روپے، ۱۲ آنے ہے،[۲] سابقہ اور موجودہ آمدنی کے اس فرق کے ساتھ یہ ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ دیوبند اور اس کے ملحق مواضعات کی بیشتر آراضی کی مالگذاری اسلامی عہد حکومت میں

---

[۱] دام (پیسہ) تانبے کے سکہ کو کہتے تھے، یہ وزن میں ایک تولہ آٹھ ماشہ سات سرخ کا ہوتا تھا۔ ۴۰ دام کا ایک روپیہ ہوتا تھا، اور روپیہ ساڑھے گیارہ ماشہ کا تھا۔ (ملاحظہ ہو آئین اکبری آئین ۱۰

[۲] موجودہ آمدنی کے اعداد و شمار سنہ ۱۳۴۵ فصلی کے ہیں، اسی سال کے محصول آب پاشی کے ۵،۴۰،۱۸۵ روپے ۱۱، آنے اس کے علاوہ ہیں۔ ۱۲ "م"

معاف تھی، صرف اکبر کے عہد کے متعلق معلوم ہو سکتا ہے کہ اس وقت ۹۴۶ و ۱۸۹ و ۲۶ دام کی مالگذاری معاف تھی اس زمانہ کے ملکی انتظام کے مطابق اسی معافی میں تحصیل دیوبند کے انتظامی اور فوجی مصارف بھی سمجھنے چاہئیں۔ (آئین اکبری ص ۱۹۱ جلد ۲)

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں برطانوی گورنمنٹ نے ایسی آراضیات کے بڑے حصہ کو ضبط کر لیا تھا۔
(ملاحظہ ہو تاریخ سہارنپور ص ۱۶۱)

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت سے قبل کے ملکی اور عدالتی نظم و نسق کے متعلق اس سے زیادہ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ دیوبند میں دیوانی اور فوجداری کی دو عدالتیں قائم تھیں، اول الذکر منصفی کے نام سے موسوم تھی اور آخر الذکر قاضی کی عدالت تھی۔

حفاظتی انتظام کے لئے پولس کے بجائے فوج رہتی تھی جو ضرورت کے وقت باہر بھی بھیجی جاتی تھی، آئین اکبری میں مقامی فوج کی تعداد ۶۰ سوار، اور ۳۰۰ پیادے بیان کیگئی ہے، فوج کے قیام کے لئے قلعہ بنا ہوا تھا،

موجودہ پولس اسٹیشن کا عملہ تین سب انسپکٹر اور ۵۰ کانسٹبلوں پر مشتمل ہے، پولس اسٹیشن کے علاوہ جو تحصیل میں ہے شہر میں پولس کی تین چوکیاں بھی ہیں، ایک ریلوے اسٹیشن کی سڑک پر، دوسری بھائیلہ کی سڑک پر اور تیسری منگلور کے راستہ میں ہے،

عدالتی نظم کے لئے جو ۱۸۰۵ء ۱۲۲۰ھ سے جاری ہے فوجداری مقدمات کے لئے تحصیلدار اور دیوانی کے لئے منصفی ہے، اس کے علاوہ ۱۰ اسپیشل مجسٹریٹ بھی مقرر ہیں۔

میونسپلٹی دیوبند میں میونسپلٹی قائم ہے جس کا نظم عوام نمائندوں کے ہاتھ میں ہے رفاہِ عام کے جملہ امور میونسپلٹی سے متعلق ہیں، یہ میونسپلٹی جون ۱۸۶۸ء ۱۲۸۵ھ میں قائم ہوئی تھی، باہر سے آنے والی اشیاء پر جو تجارت کی غرض سے لائی جائیں چنگی مقرر

ہے، چنگی کے قوانین کی رو سے ایسی اشیاء پر بھی محصول مقرر ہے جو اگرچہ فروختگی کے لئے نہ لائی جائیں مگر اپنی تعداد کے لحاظ سے اس قدر ہوں کہ ان کی خرید و فروخت کی جاسکے، دیوبند میں چنگی کا محصول مالیت پر لیا جاتا ہے، جو وزن کے محصول کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتا ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ دیوبند کی تجارت کو جس قدر فروغ ہونا چاہیئے تھا وہ نہیں ہوسکا، قرب وجوار کے دیہات کی خام اشیاء، دیوبند کے بجائے مظفر نگر اور سہارنپور کی منڈیوں میں (جہاں مالیت کے بجائے وزن پر محصول مقرر ہے)، لے جائی جاتی ہیں۔

۵۰-۱۹۴۹ء میں دیوبند میونسپلٹی کی آمدنی ۱،۰۸،۵۴۱ روپے تھی، آمدنی کے بڑے ذرائع چنگی اور مکانوں کا ٹیکس ہیں۔

میونسپل بورڈ کے ممبران کی تعداد ۱۱ ہے جس میں ۶ مسلم اور ۵ غیر مسلم ہوتے ہیں، جدید دستور کی رو سے یہ تعداد ۲۵ کردی گئی ہے، ان میں ۱۶ مسلم اور ۹ غیر مسلم ہیں۔

دیوبند ایک ادیب کی نظر میں

مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ نے "ہدیۃ السنیہ" میں یہاں کی عمارتوں، آب و ہوا، صنعت و حرفت، جنگل، پیداوار اور باشندوں کی مزاجی کیفیت کا نہایت لطیف ادیبانہ پیرایہ میں تعارف کرایا ہے ذیل میں اس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے، مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

"دیوبند میں وسیع عبادت گاہیں، بلند مسجدیں، مشہور نشانات، قابل زیارت مزارات بہترین آثار، مبارک خبریں، مضبوط عمارتیں، مستحکم اور محفوظ مکانات اور بلند کوٹھیاں ہیں، یہ شہر خیر سے قریب اور شر سے دور رہے، یہ پاکیزہ بستی لطافت اور صفائی کے لحاظ سے نہایت خوب صورت ہے، اس کے جنگل میں درخت اور پھل، تفریح گاہیں اور نہریں

حوض اور باغیچے اور خوش منظر جھاڑیاں ہیں، آب وہوا کے اعتبار سے نہایت عمدہ اور صبح وشام کی لطافت کے لحاظ سے عجیب وغریب ہے، ہوا ایسی منور اور روشن کہ روح وجسم کے لئے قوت بخش ہے، اس کی زمین کنوانی بارش کو قبول کرنے والی سرسبز اور شاداب ہے، چکنی مٹی چونہ سے زیادہ مضبوط اور کہگل، سیسہ کی مانند مضبوط ہے اس سے یہاں کے باشندوں کی قوت مزاجی اور پختگی طبائع پر استدلال کیا جاسکتا ہے یہاں کا پانی ٹھنڈا، شیریں اور ہلکا ہے، اور اپنی خوبیوں کے لحاظ سے آب حیات سے بڑھا ہوا ہے، یہاں تاجروں اور شہروں کے سامان تجارت کی منڈی ہے، دور دراز کے لوگ یہاں آتے اور ٹھہرتے ہیں، مسافروں کے لئے بہترین فرودگاہ ہے، خصوصاً جب سے ریل جاری ہوئی ہے اس وقت سے تو قریب کے مسافروں کے لئے ناشتہ گاہ اور دور کے لوگوں کے لئے شام کے کھانے کی جگہ بن گیا ہے،

پرانے زمانہ میں یہاں کی اعلیٰ درجہ کی صیقل کی ہوئی تلواریں مشہور تھیں، اسی طرح عمدہ قسم کے سوتی کپڑے میں دیوبند مشہور تھا۔ گنّا اور شکر تو دیوبند جیسی شاذ ہی کہیں ہوتی ہو، ذائقہ میں شہد اور خوشبو میں رند کی مانند ہے، اس کی خصوصیات سے سمرقند کو کیا نسبت ؟۔ یہاں کے باشندے خدا ترس، بادشاہ کے مطیع، علماء کے فرمانبردار، فقراء کے گرویدہ ہیں، اکثر شرفاء حضرت عثمان ذی النورین رضی کی اولاد میں سے ہیں۔

اس شہر کے منجملہ اور فضائل کے عمدہ آموں کی کثرت اور ان کی لطافت و پاکیزگی ہے، یہ جنت کے میووں سے زیادہ مشابہ ہیں، رنگ میں عجیب وغریب اور خوشبو میں بہترین اور طرح طرح کے لذیذ ذائقوں والے ہیں، ان کے رنگوں کا یہ حال ہے کہ

بعض انار کی طرح سُرخ ہیں گویا سبز درختوں میں آگ لگی ہوئی ہے، اور بعض تیز زرد ہیں کہ دیکھنے والوں کی نظروں کو بھلے معلوم ہوتے ہیں، مشتاق لوگ اس کو دیکھنے سے تعجب کرتے ہیں جو اپنی سبزی میں ساری سبزیوں سے فائق ہوگئے ہیں۔ (الہدیۃ السنیہ ص۱۰)

شب برات کی لڑائی

دیوبند کے حالات میں شب برات کی لڑائی کو ایک زمانہ میں بڑی اہمیت حاصل تھی، وقائع نگار کی حیثیت سے میرا فریضہ ہے کہ اس تاریخی رسم کی تفصیلات پیش کروں، دیوبند میں عرصہ سے یہ رواج چلا آتا تھا کہ ہر سال ۱۴،۱۵ ارشعبان کی راتوں میں ایک زبردست نمائشی جنگ ہوتی تھی جو "شب برات کی لڑائی" کے نام سے موسوم تھی، اس لڑائی میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شریک ہوتے تھے مسلمانوں کی ہر ایک برادری کے نہ صرف نوجوان بلکہ بچے اور بوڑھے تک اس میں حصہ لیتے تھے،

معمول یہ تھا کہ شہر کو دو حصوں پر تقسیم کرلیا گیا تھا، ایک حصہ "کوٹلہ" کے نام سے موسوم تھا اور دوسرا گروہ "شہر والا" کہلاتا تھا، دونوں گروہوں کا علیحدہ علیحدہ سالار ہوتا تھا، ہر ایک گروہ میں متعدد گروپ ہوتے تھے جو "ٹھولہ" کے نام سے موسوم کئے جاتی تھے، ایک ٹھولہ کئی کئی سو افراد پر مشتمل ہوتا تھا، لڑائی آبادی سے باہر جنگل میں ہوتی تھی، ہر ایک فریق اور ٹھولہ کا ایک مقام مقرر ہوتا تھا، جو اس فریق کا "مورچہ" کہلاتا تھا، دونوں فریقوں کے درمیان "خط فاصل" قائم ہوتا تھا جس کے عبور پر فتح و شکست کا انحصار تھا، جو فریق ہار جاتا وہ میدان چھوڑ کر چلا جاتا، فاتح فریق اس کے "مورچہ" پر قابض ہوکر اپنی فتح کے شادیانے بجاکر اپنے قبضہ کا اعلان کرتا۔

لڑائی کی صورت یہ تھی کہ ۱۴ ارشعبان کو آدھی رات کے قریب "ٹھولے" اپنے اپنے

محلوں سے نکلتے، باجے ساتھ ہوتے تھے، بارہ[۱۲] بجے تک ہر ایک فریق اور ٹھولہ اپنے مقررہ مورچہ پر پہنچ کر قابض ہو جاتا، نصف شب گذرنے پر لڑائی شروع ہو جاتی جو فیصلہ کُن نہ ہونے کی صورت میں صبح تک جاری رہتی، اگر صبح تک کسی فریق کو شکست نہ ہوتی تو سفید جھنڈے دکھلا کر لڑائی آئندہ شب کے لئے ملتوی کر دی جاتی، اگرچہ لڑائی پہلی شب میں بھی پوری قوت کے ساتھ لڑی جاتی مگر فتح و شکست کا انحصار دوسری شب کی آخری لڑائی پر تھا، جو فریق اس میں جیت جاتا وہ آئندہ سال تک جیتا ہوا سمجھا جاتا تھا۔

اس لڑائی میں تین قسم کے حربے استعمال کئے جاتے تھے، بیل[۱] جو ایک درخت کا پھل ہوتا ہے اس کا گودا نکال کر اندر سے خالی کر کے اس میں بارود بھر کر بیل کا منھ بند کر دیا جاتا ہر شخص بیلوں کی کافی تعداد اپنے ساتھ رکھتا، یہ بیلیں دن میں بھر لی جاتی تھیں، لڑائی کے وقت اس میں آگ لگا کر بیل کو فریق مخالف پر پھینکتے تھے، یہ نہایت خطرناک قسم کی آتش گیر چیز تھی، اس کا وزن ڈیڑھ پاؤ سے لیکر آدھ سیر تک ہوتا تھا۔

دوسرا[۲] حربہ گوپیا تھا جس میں پتھر رکھکر چلایا جاتا تھا، یہ دونوں چیزیں تو دور کیلئے تھیں، جب مخالف گروہ ایک دوسرے سے قریب ہو جاتے تو دست بدست جنگ ہوتی جس میں لاٹھی[۳] استعمال کی جاتی تھی، ہر ایک فریق دوسرے فریق پر قطعاً دشمن کی طرح حملہ آور ہوتا تھا،

اس لڑائی کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں خواہ کتنے ہی آدمی کیوں نہ مر جائیں اُن کے ورثاء ان کے خون کا مطالبہ نہیں کرتے تھے، زخمیوں کا تو کوئی ذکر ہی نہیں ہے، وہی لوگ جو رات کو دشمنوں کی طرح ایک دوسرے سے برسرپیکار ہوتے، صبح کو انھیں لوگوں کی جنھیں انھوں نے مجروح کیا تھا، مرہم پٹی اور تیمارداری کرتے نظر آتے تھے، جماعتی فتح و

شکست کے علاوہ انفرادی انتقام کے جذبہ کا ان میں شائبہ تک نہیں ہوتا تھا۔

دیوبند میں نامعلوم مدت سے اس لڑائی کا سالانہ دستور چلا آرہا تھا انگریزی حکومت نے اس لڑائی کو مسلمانوں کی رسم سمجھکر اس سے تعرض کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ۱۳۶۷ھ / ۱۹۴۸ء کے شعبان سے مقامی حکام کے ایماء سے یہ لڑائی بند ہوگئی ہے۔

آب وہوا دیوبند کوہ ہمالیہ کے قریب چونکہ دوآبہ گنگا اور جمنا سے سیراب ہونے والے علاقے میں واقع ہیں اس لئے یہاں کی زمین بالعموم زرخیز ہے، آب وہوا پہلے نہایت خوش گوار اور معتدل تھی، پانی ٹھنڈا، شیریں اور ہلکا تھا مگر اب کچھ عرصہ سے آب وہوا مرطوب ہوگئی ہے جس کی وجہ سے نزلہ و زکام اور اکثر وبائی امراض کی کثرت رہتی ہے، اسی طرح پہلے یہاں کے موسموں میں بھی اعتدال پایا جاتا تھا مگر اب گرمی اور سردی میں شدت پیدا ہوگئی ہے جس سے موسموں کا اعتدال باقی نہیں رہا، دسمبر اور جنوری میں سخت سردی ہوتی ہے ان مہینوں میں عموماً سرد برفیلی ہوائیں چلتی ہیں، مئی جون سخت گرمی اور لُو کے مہینے ہیں، جولائی اور اگست میں برسات ہوتی ہے، اس زمانہ میں موسم نسبتاً اعتدال پر رہتا ہے،

صنعت وحرفت دیوبند کی مصنوعات میں کرگھے کا بنا ہوا کپڑا جو باریک اور مہین ہوتا ہے قرب وجوار میں عام طور پر پسند کیا جاتا ہے، ددنئی اور کھلونوں میں پی پیاں بھی مشہور ہیں اور دُور دُور تک یہ چیزیں یہاں سے جاتی ہیں، پرانے زمانے میں یہاں کی تلواریں نفاست کے اعتبار سے بہت عمدہ ہوتی تھیں، ان گھریلو صنعتوں کے علاوہ شکر سازی کا ایک عظیم الشان کارخانہ (مِل) بھی ہے، اس مل کی شکر دوسرے ملوں کے مقابلہ میں اپنی نفاست اور عمدگی کے لحاظ سے خاص امتیاز رکھتی ہے، گزشتہ

سال سے برف بنانے کا بھی ایک کارخانہ جاری ہے

تجارت تجارت میں عام تجارتی کاروبار کے علاوہ دینی کتب کی تجارت کو خاص اہمیت حاصل ہے پہلے یہاں ایک اعلیٰ درجہ کا لیتھو کی چھپائی کا مطبع بھی "مطبع قاسمی کے نام سے جاری تھا جو اب کچھ عرصہ سے بند ہو چکا ہے اس مطبع کی چھپی ہوئی کتابیں ملک کے دینی حلقوں میں بڑی عظمت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں، اس وقت بھی ایک پریس "ثروت پریس" کے نام سے جاری ہے، اس میں ٹائپ اور بلاک کی طباعت ہوتی ہے،

تجارتی کتب خانوں میں "کتب خانہ اعزازیہ" کتب خانہ امدادیہ، اور کتب خانہ رحیمیہ اپنے کاروبار کی وسعت کے لحاظ سے خاص اہمیت کے مالک سمجھے جاتے ہیں ان کے علاوہ بھی متعدد کتب خانے ہیں، یہ کتب خانے ہند و پاکستان کے مسلمانوں کی دینی کتب کی ضرورت کو بڑی حد تک پورا کرتے ہیں، اور تبلیغی لٹریچر کے ذریعہ دین کی زبردست خدمت انجام دے رہے ہیں۔

اخبارات و رسائل پچھلے چالیس سال میں دیوبند سے متعدد ماہنامے اور ہفتہ وار اخبار بھی نکلتے رہے ہیں، ماہناموں میں "القاسم"۔ "الرشید" "قاسم العلوم" اور "خالد"۔ ہفتہ وار میں "مہاجر" اور "الانصار" - اور "استقلال" مشہور ماہنامے اور اخبار تھے،

اس وقت دار العلوم کے ماہنامہ کے علاوہ "ہادی" اور "تجلی" دو ماہنامے نکل رہے ہیں، "ہادی" دینی اور علمی حلقوں میں اور "تجلی" دینی، علمی اور ادبی حلقے میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، "تجلی" کی ادارت کے فرائض دیوبند کے مشہور علمی خاندان

کے ایک ہونہار نوجوان شاعر عامر عثمانی انجام دیتے ہیں۔

مسلمانوں کی اقتصادی اور دینی حالت

اگرچہ اہل ہنود کی اقتصادی حالت عمدہ اور روبترقی ہے، اور وہ عموماً جدید تعلیم کے زیور سے آراستہ ہیں، مگر مسلمان پچھلے سو برس سے بالعموم نکبت اور افلاس کی شکنجے میں کسے ہوئے ہیں، شرفا کی جائدادیں عام طور سے مہاجنوں کے قرضوں کی نذر ہوچکی ہیں، البتہ دین داری کے لحاظ سے ان کی حالت فی الجملہ قابلِ اطمینان ہے، دارالعلوم کی ایک سالانہ روداد میں یہاں کے مسلمانوں کی دین داری کی نسبت لکھا ہے کہ

"یہاں مدرسہ (دارالعلوم) کے جاری ہوتے ہی ہر گھر میں علم کا چرچا ہوگیا، اور وہ خاندان جن میں علم کا نشان تک نہ تھا ان میں عالم باعمل پیدا ہوگئے، کوئی خاندان بلکہ کوئی گھر ایسا نہ رہا جس میں علم کا دخل نہ ہوا ہو، یا جس میں کتب دینیہ کا مشغلہ اور مطالعہ نہ ہوتا ہو، اہل دیوبند جس مستعدی سے طلبا اور مدرسہ کی خدمت کے لئے کھڑے ہوئے اور جس سرعت و قابلیت کے ساتھ علم کے اثر کو قبول کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ اس جگہ سے بہتر کوئی دوسری جگہ تھی اور نہ اہل دیوبند سے زیادہ دوسرے لوگ اس کام کے قابل تھے، دیوبند میں مدرسہ کی بدولت علم کا جس قدر گھر گھر چرچا ہوا اور جو جو فوائد دینی و دنیوی مدرسہ اور بزرگان دین کی صحبت و خدمت سے انکو حاصل ہوئے اور جیسی کچھ برکات ظاہری و باطنی سے معمور ہوکر دولت علم و عمل سے وہ مالا مال ہوئے اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کرسکتے ہیں جنھوں نے مدرسہ سے قبل یہاں کی حالت دیکھی ہو، اور اب موجودہ حالت کو دیکھکر موازنہ کریں۔"

(روداد دارالعلوم بابت ۱۳۳۰ھ ص ۲)

عام معاشی کیفیت

ستمبر ۱۹۴۶ء کے راشننگ سسٹم کے اعداد و شمار کے مطابق دیوبند میں ۲۴۹۱ گھر ایسے ہیں جن کے افراد کی آمدنی ۴۰ روپے ماہانہ سے زیادہ ہے، اور ۲۹۱۵ گھر ایسے ہیں جن کے افراد کی آمدنی ۴۰ روپے ماہوار یا اس سے کم ہے،

مردم شماری

۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطابق دیوبند کی آبادی ۲۵،۸۷۲ - افراد پر مشتمل ہے، ان میں ۱۵،۴۳۴ مسلمان ہیں اور ۱۰،۴۳۸ غیر مسلم

پیداوار

دیوبند کی زمین بہت زرخیز ہے اس کو دریائے گنگا کا پانی سیراب کرتا ہے، دیوبند کے علاقہ میں، گیہوں، جو، چنا، سرسوں، گوجی، جوی، مٹر وغیرہ فصل ربیع کی خاص پیداوار ہیں۔ فصل خریف میں چاول جس کی بہت سی قسمیں ہیں بکثرت پیدا ہوتا ہے ان میں "باسمتی" نہایت عمدہ اور بے حد لذیذ چاول ہے، مکئی، جوار، باجرہ، مونٹھ، ارہر اور اڑد بھی پیدا ہوتے ہیں، اسی فصل میں کپاس کے علاوہ گنا بھی بکثرت پیدا ہوتا ہے، اس کی بھی بہت سی قسمیں تھیں، مگر اب عام طور پر جو گنا پیدا ہوتا ہے وہ "فارم" کا گنا کہلاتا ہے،

پھلوں میں آم کو سب پھلوں پر فوقیت حاصل ہے، دیسی عام کے علاوہ تخمی اور قلمی کی بہت سی اقسام ہیں، امرود، انار، انگور، کیلا، سنگترہ، لوکاٹ، نارنگی، آلوبخارہ، ناشپاتی، لیچی، خربزہ، تربوز، پپیتا، سنگھاڑا، جامن، لیموں، کٹھل، چمرخ وغیرہ بھی کم وبیش پیدا ہوتے ہیں۔

سبزیوں میں آلو، گوبھی، ٹماٹر، شلجم، سویا، پالک، خرفہ، کدو، توری، بھنڈی، ٹنڈہ، چقندر، گاجر، مولی، پیاز، لہسن، میتھی اور لوبیا وغیرہ ہیں۔

قدیم عمارتیں

دیوبند کی قدیم عمارتیں بالعموم چھوٹی اینٹ کی ہیں، جس کو "لکھوری" کہتے ہیں، اکثر عمارتیں بلند اور عالی شان ہیں، اور بیشتر مسلمانوں کے عروج و اقبال اور امارت رفتہ کے زمانہ کی یادگار ہیں، ان میں سے زیادہ تر مرورِ ایام اور انقلاب زمانہ کے باعث نیست و نابود ہو چکی ہیں، ان عمارتوں کے آثار اور کھنڈر خود زبان حال سے اپنی عظمت کی داستان سُنا رہے ہیں، جو باقی رہ گئی ہیں وہ نہایت خستہ اور شکستہ حالت میں ہیں، غالب گمان یہ ہے کہ یہ عمارتیں آٹھویں صدی ہجری سے لیکر گیارہویں صدی ہجری تک کی بنی ہوئی ہیں، بعض جگہ قدیم مقبروں اور مزاروں کے آثار بھی پائے جاتے ہیں، مشہور روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے اولیاء اور اہل اللہ اس زمین میں آسودۂ خواب ہیں۔

ان عالی شان عمارتوں اور ان کے کھنڈروں کو دیکھکر ان کے بنانے والوں کی دولت و ثروت، سطوت و عظمت اور ریاست و حکومت کا ایک دل آویز خواب نظر آنے لگتا ہے اور انسان ماضی کے پرکیف رنگین خواب میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔

یہ عمارتیں عموماً شاہانہ وضع کی ہیں، ان کی کشادگی اور وسعت کا یہ عالم ہے کہ کئی کئی فرلانگ کے رقبے میں پھیلی ہوئی ہیں، ہر عمارت دوسری عمارت سے خاصے فاصلے پر تھی، اور یہ سب شہر کی آبادی سے باہر تھیں، ان میں قریب کی بعض عمارتیں اب آبادی میں شامل ہو گئی ہیں اور جو کسی قدر فاصلہ پر تھیں وہ ابھی تک آبادی سے علیحدہ ہیں، اُن میں بعض آباد بھی ہیں اور ان کے بنانے والوں ہی کی اولاد اُن میں رہتی ہے، بعض میں اُن

کے ورثاء کی رعایا کے لوگ آباد ہو گئے ہیں، آج جس قدر بھی عمارتیں موجود ہیں ان کے اندرونی مکانات کسی میں بھی باقی نہیں رہے ہیں صرف باہر کی چہار دیواریاں، یا دروازے رہ گئے ہیں

میں یہاں صرف ان عمارتوں کا ذکر کرونگا جن کے کچھ نہ کچھ حالات معلوم ہو سکے ہیں ورنہ بہت سے آثار ان سے بھی زیادہ قدیم اور اہم ہیں مگر چونکہ ان کے صحیح حالات معلوم نہیں ہو سکے اس لئے مجبوراً ان کو نظر انداز کرنا پڑا ہے۔

دیوان یہ عظیم الشان عمارت دار العلوم کے مشرق میں لب شاہ راہ واقع ہے، اس کا سر بفلک دروازہ شکستگی کے باوجود آج بھی بڑی عظمت کا مالک سمجھا جاتا ہے، اس عمارت کا دروازہ، برج اور محراب فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہیں، عمارت "لکھوری"[ف۱] اینٹ کی ہے، اس وقت دروازہ اور چہار دیواری کا کچھ حصہ باقی رہ گیا ہے، موجودہ مکانات سب بعد کے تعمیر شدہ ہیں، دروازہ کے قریب، دیوان خانہ کے آثار نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں، یہ عمارت شیخ لطف اللہ عثمانی کی یادگار ہے جو شاہجہاں کے عہد میں شاہی دیوان (خزانچی)، کے منصب پر فائز تھے، انھوں نے اورنگ زیب کی ابتدائے حکومت کے زمانہ میں یہ عمارت تعمیر کرائی تھی، کہا جاتا ہے کہ اورنگ آباد دکن میں بھی شیخ لطف اللہ نے بالکل اسی وضع کی ایک حویلی تیار کرائی تھی، یہ دروازہ پانچ منزل کا بتلایا جاتا ہے، اوپر کی دو منزلیں گر چکی ہیں، لکھوری اینٹ کے علاوہ جابجا سنگ سرخ بھی استعمال کیا گیا ہے، کواڑوں کی چولیں اوپر کی جانب جو پتھر لگا ہوا ہے لوگوں کا بیان ہے کہ بارش ہونے

ف۱:- اس کے متعلق سنا ہے کہ اس وقت ایک روپیہ کی ایک لاکھ آتی تھیں اسی وجہ سے اسکو "لکھوری" کہا جاتا تھا یہ اینٹ موجودہ اینٹ سے جسامت میں نصف ہوتی ہے، اس کی موٹائی ۱½ انچ لمبائی ۵۔ انچ چوڑائی ۴۔ انچ ہے

سے پہلے اس میں نمی ظاہر ہونے لگتی ہے، دروازہ کی محراب کی ڈاٹ پھٹ گئی تھی ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء میں اس کی مرمت کرائی گئی ہے، اس عمارت میں جو اب محلہ دیوان کے نام سے موسوم ہے۔ دیوان لطف اللہ کے اخلاف رہتے ہیں۔

مالیوں کی سرائے

شہر سے باہر شمال کی جانب واقع ہے، اس کی چہار دیواری بہت زیادہ قدیم التعمیر معلوم ہوتی ہے، یہ عمارت کب؟ اور کس نے تعمیر کی؟ اس پر گمنامی کا گہرا پردہ پڑا ہوا ہے، صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ رؤسا شیوخ اس کے بنانے والے تھے اور اس میں متعدد رؤسا کی حویلیاں تھیں، یہ سرائے اور اس کے گرد ونواح کی زمین ابھی تک عثمانی شیوخ کی ملکیت ہے، ایک مسجد جو اسی عمارت کے ساتھ کی تعمیر بتلائی جاتی ہے احاطہ کے اندر موجود ہے، مگر افسوس کہ اس میں کتبہ نہیں ہے، حویلی کا احاطہ بہت وسیع ہے، آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں عظیم الشان عمارت ہوگی مکانات یکسر معدوم ہو چکے ہیں، چہار دیواری کا بھی بیشتر حصہ حوادثِ روزگار کی نذر ہو چکا ہے،

سرائے پیرزادگان

یہ سرائے شہر سے باہر جنوب کی جانب دیوی کنڈ کے متصل واقع ہے، حضرت الحاج سید محمد ابراہیم قدس اللہ سرہٗ کی یہ خانقاہ تھی، سید صاحب گیارہویں صدی کے اوائل میں لکھنؤ سے آکر یہاں مقیم ہوئے تھے، اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ دیوبند اور اس کے اطراف وجوانب میں سید صاحبؒ کی دعوت و تبلیغ سے بہت سے لوگ متأثر ہو کر اسلام کے حلقہ بگوش ہوگئے تھے، سید صاحبؒ کی خانقاہ میں باطنی اصلاح اور تزکیۂ نفس کے علاوہ علم ظاہر کی تعلیم پر بھی کماحقہٗ توجہ کی جاتی تھی، سید صاحبؒ کی وفات کے بعد جو ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء میں ہوئی ان کے فرزند بندگی سید محمد اسمٰعیلؒ نے یہ حویلی تیار کرائی، مسجد شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں بن چکی تھی (اس کا ذکر مساجد کے بیان میں آئیگا)،

اب اس مسجد کے علاوہ اس زمانہ کی تعمیر باقی نہیں رہی، البتہ چہار دیواری اور مکانات کے آثار جا بجا ملتے ہیں، سید صاحبؒ کی اولاد شہر میں منتقل ہوگئی ہے صرف دو ایک گھر باقی رہ گئے ہیں، آج کل مسلمانوں کی ایک زراعت پیشہ قوم اس میں آباد ہے

کوٹلہ دیوبند سے پانچ چھ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں پر ڑ واقع ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ عمارت اس موضع پر ڑ کے رئیس شیخ محمد محسن صاحب کی بنوائی ہوئی ہے اور ان ہی کی اولاد مع اپنی رعایا کے اس میں رہتی ہے، اس کی چہار دیواری اور دروازہ متوسط درجہ کے ہیں اور دونوں اپنی عمر کی آخری گھڑیوں سے گذر رہے ہیں، زمانۂ تعمیر کا پتہ نہیں چل سکا

قلعہ جس قلعہ کے نام سے یہ مقام موسوم ہے، وہ معدوم ہو چکا ہے، شہنشاہ اکبر کے عہد میں یہ قلعہ موجود تھا، ابو الفضل نے آئین اکبری میں اس کا ذکر کیا ہے، اور پختہ اینٹوں کی تعمیر بتلایا ہے اس کے الفاظ ہیں "قلعہ از خشت پختہ دارد"[1] البتہ اس کے آثار موجود ہیں، قلعہ کا مقام عام سطح سے کافی بلند ہے، اس مقام پر ایک مسجد صحیح حالت میں موجود ہے اور اس میں کتبہ بھی نصب ہے، یہ ۹۱۰ھ ۱۵۰۴ء میں کرم جہاں فیروز ملک محمد لطف اللہ خاں افغان کے اہتمام میں تعمیر ہوئی ہے، کتبہ میں سلطان سکندر لودہی کا نام کندہ ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ قلعہ حسن خاں نے جو دیوبند کا حاکم تھا تعمیر کرایا تھا۔ اور یہ قلعہ اسی قدیم شکستہ قلعہ کی بنیاد پر تعمیر کرایا گیا تھا، جو راجگان ہستنا پور کا بنوایا ہوا تھا۔

حسن خاں کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ سلطان حسین مشرقی شاہ جونپور کا بھائی تھا۔ بہلول شاہ لودہی کے عہد میں جب جونپور کی سلطنت تباہ ہوئی تو حسن خاں نے شہنشاہ

---

[1] آئین اکبری جلد دوم صفحہ ۱۴۳

ہند کی ملازمت اختیار کرلی، سکندر شاہ کے عہد میں اس کو دیوبند کا حاکم بنا کر بھیجا گیا بعض لوگوں کا بیان یہ ہے کہ قلعہ اور مسجد مرزا احسن بیگ کے بنوائے ہوئے ہیں، جو سلطان شہاب الدین غوری کے عہد میں دیوبند کا حاکم تھا، یہ بیان صحیح نہیں ہے، کیونکہ مرزا احسن بیگ اپنے نام کے امتیاز سے مغل معلوم ہوتا ہے، اس کا دیوبند آنا: تاریخ ضلع سہارنپور کی روایت کے مطابق سلطان شہاب الدین غوری کے زمانہ میں بتلایا جاتا ہے اور یہ زمانہ مسجد کی تعمیر سے جیساکہ اس کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے بہت قبل کا ہے، اس بناء پر قلعہ اور مسجد کے بنوانے کی نسبت مرزا احسن بیگ کی جانب منسوب کرنا صحیح نہیں ہے

خانقاہ یہ عمارت دارالعلوم کے مغرب میں واقع ہے، اکبر کے ابتدائے عہد حکومت میں ایک بزرگ شیخ جیا صاحبؒ اجمیر سے دیوبند آئے اور یہیں مقیم ہوگئے، اکبر پر ان کی بزرگی کا خاص اثر تھا، چنانچہ شیخ جیا صاحبؒ کے قیام کے لئے مرزا بیگ ابن خواجہ محب علی بخشی کے ذریعہ اکبر کے حکم سے خانقاہ اور مسجد شاہی مصارف سے تعمیر کرائی گئیں، مسجد اب تک صحیح حالت میں موجود ہے، مگر خانقاہ کی عمارت کا بہت کم حصہ باقی رہ گیا ہے، شیوخ کے علاوہ اب اس میں متعدد غیر مسلم قومیں آباد ہیں۔

دیوبند کے مسلمانوں کی ان عمارتوں کی بوسیدگی اور شکستگی کو دیکھکر ایک سیّاح کے دل میں بار بار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر مستحکم اور مضبوط عمارتیں اتنی جلد کیوں کر منہدم ہوگئیں جبکہ دوسرے مقامات پر ان سے زیادہ قدیم عمارتیں آج تک اپنی پُرانی آن بان کے ساتھ سر اُٹھائے کھڑی ہیں؟ میرے نزدیک ان عمارتوں کے اس قدر جلد حوادث روزگار کی نذر ہو جلنے کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کی سلطنت کے آخری دور میں بد امنی کے باعث دیوبند کو متعدد مرتبہ تاخت و تاراج اور آتش زدگی سے

دوچار ہونا پڑا، جس سے پے در پے نہ صرف یہ کہ ان عمارتوں ہی کو نقصان پہنچا، بلکہ مکین بھی پیہم لوٹ مار کی وجہ سے مالی اعتبار سے ایسے تباہ اور برباد ہوئے کہ آج تک پنپ نہیں سکے، ایسی حالت میں کون ان عمارتوں کی شکست وریخت کی مرمت کراکر اپنے آبا واجداد کی یادگاروں کو باقی رکھ سکنے کی ہمت کرسکتا تھا، اور یہ ظاہر ہے کہ جب کسی عمارت کو کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دیا جائے تو وہ زیادہ عرصہ تک زمانہ کے انقلابات کا مقابلہ نہیں کرسکے گی۔

دو قدیم مکان محلہ کائستھ واڑہ میں ایک شمال رویہ مکان جو بابو نند کشور بھٹناگر کی ملکیت میں ہے اس کے چوبی دروازہ کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ اس پر سنسکرت میں ۱۷۸ سمبت بکرمی لکھا ہوا ہے، جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس دروازہ پر ۱۸۳۵ سال گذر چکے ہیں، میں نے اس کو جس وقت دیکھا تو عبارت اور حروف اس قدر شکستہ اور محو ہو چکے تھے کہ ان کو پڑھ سکنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں تھا، البتہ اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اس مقام پر کوئی عبارت لکھی ہوئی تھی، اگرچہ مکان کی عمارت میں کافی تبدل و تغیر ہو چکا ہے، مگر دروازہ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ جوں کا توں ہے، جہاں تک مجھے معلوم ہے آج دنیا میں اس قدر پرانی لکڑی جو بغیر کسی پالش کے اتنی مدت تک باقی رہی ہو، غالباً کہیں موجود نہیں ہے، لکڑی کے ماہرین کی رائے ہے کہ مضبوط سے مضبوط لکڑی تین سو سال سے زائد باقی نہیں رہتی، بشرطیکہ پانی کے اثر سے محفوظ رکھی جائے، مگر اس دروازہ میں پانی سے حفاظت کا کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے، ایسی حالت میں اسکی اٹھارہ سو سال کی عمر پر یقین کرنا مشکل ہے۔

ایک اور مکان بھی کافی قدیم بتلایا جاتا ہے، اس مکان کے دروازہ کی چوکھٹ

گو حسب معمول لکڑی کی ہے، مگر اپنے بہترین نقش و نگار اور تصاویر کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کی صناعی کا نمونہ ہے، اوپر کی جانب پر چوکھٹ تقریباً دو فٹ چوڑی ہے اور اسی میں بڑی بڑی مورتیاں تراشی ہوئی ہیں، مورتیوں کے اوپر معلوم ہوتا ہے سنسکرت یا ہندی میں کچھ عبارت کندہ ہے مگر اس مقام سے لکڑی اس قدر خراب اور بوسیدہ ہوگئی ہے کہ عبارت پڑھی نہیں جاتی،

یہ مکان پنڈت مادھو پرشاد کے جو اس مکان کے مالک ہیں، بزرگوں کا بنوایا ہوا بتلایا جاتا ہے میرے دریافت کرنے پر پنڈت مادھو پرشاد نے کہا کہ وہ "یہ تو نہیں بتلا سکتے کہ یہ مکان اور اس کا دروازہ کب تعمیر ہوا، اس لئے کہ تمام خاندانی کاغذات سکھوں کی لوٹ مار میں ضائع ہوگئے" اس سلسلہ میں پنڈت جی نے ایک دلچسپ واقعہ بھی سنایا وہ یہ کہ

"ان کے گھرانے میں ایک بیل تھی جس میں اکسیر بھری ہوئی تھی، جس کی آمیزش سے تانبا سونا بن جاتا ہے، جب سکھوں نے مکان لوٹا تو یہ بیل بھی دوسری قیمتی اشیاء کے ساتھ ان کے ہاتھ لگی، سکھ بھی اس بیل کی تلاش میں تھے، مگر اس کی شکل و صورت سے واقف نہ تھے انھوں نے صاحب خانہ سے پوچھا یہ کیا ہے؟ اس نے اس خیال سے کہ شاید کسی طرح یہ بیل بچ جائے بتلایا کہ اس میں تمباکو ہے، سکھوں نے تمباکو سے نفرت کے باعث اس کو آگ میں پھینک دیا اور چلے گئے، بعد میں جب آگ میں دیکھا تو بیل کے بجائے سونا موجود تھا"

دیوی کنڈ

شہر کے جنوب و مشرق میں سندری دیوی کا مشہور مندر اور تالاب واقع ہے، زمانۂ قدیم میں اس کے گرد و نواح میں جنگل کی کثرت تھی

جس میں جوگی اور سنیاسی رہتے تھے، جس جگہ پر مندر واقع ہے وہ دیوی کنڈ کے نام سے موسوم ہے، مندر کی عمارت بہت پرانی تبلائی جاتی ہے، مگر مدت کی صحیح تعیین نہیں کی جاتی، تاہم کہا جاتا ہے کہ موجودہ عمارت پانچ سو برس سے زیادہ کی بنی ہوئی ہے، مندر سے ملحق ایک بڑا اور پُر فضا تالاب ہے، جس کے گھاٹ پختہ بنے ہوئے ہیں، یہ جگہ قدیم الایام سے ہندوؤں کی تیرتھ گاہ ہے، یہاں ایک شاندار سالانہ میلہ چیت شدی دو اشٹی لغایت بیساکھ بدی یکم کو ہوتا ہے، جس میں مختلف اطراف وجوانب سے ہزاروں آدمی دیوی کی پوجا و پرستش کے لئے آتے ہیں۔

پہلے یہ میلہ معمولی طور پر ہوتا تھا، مگر ۱۹۳۳ء سے میونسپلٹی نے اس کے انتظام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے، اور اب ملک کے شائستہ میلوں کی طرح اسے آراستہ کیا جانے لگا ہے، مندر سے متصل سنسکرت کا ایک ودیالیہ (مدرسہ) بھی قائم ہے۔

سُندری دیوی کے مندر کے علاوہ اور بھی بعض مندر قدیم تبلائے جاتے ہیں مگر افسوس ہے کہ نہ تو ان کے زمانۂ تعمیر کا پتہ چلتا ہے اور نہ بنانے والوں کا، اور نہ ان کے ساتھ کوئی تاریخی واقعہ وابستہ ہے، اس لئے اُن کو نظر انداز کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

تاریخی مساجد

دیوبند میں مسجدیں بڑی کثرت سے ہیں، اور بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ عموماً سب آباد ہیں اور سب میں پنجگانہ نمازیں باجماعت ہوتی ہیں، بڑی چھوٹی سب ملاکر تخمیناً سو سے زائد ہیں، آبادی کے تناسب کے لحاظ سے بہت کم مقامات ایسے ہونگے، جو اس بارے میں دیوبند پر فوقیت لے جاسکیں گے

چھ مسجدیں مختلف شاہان دہلی کے زمانوں کی تعمیر شدہ ہیں، ان میں سے چند پر سنگی کتبے بھی موجود ہیں، چھ مسجدوں میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے۔ تاریخی حیثیت رکھنے والی مسجدیں حسب ذیل ہیں

مسجد چھتہ — یہ مسجد شہر کی مغربی جانب اور دارالعلوم کے جنوبی مشرقی گوشہ میں واقع ہے، ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم کا افتتاح اسی مسجد میں ہوا تھا، یہ مسجد ہندوستان میں مسلمانوں کے ابتدائے طرز تعمیر کا نہایت سادہ مگر پُرشکوہ نمونہ ہے، یہ لکھوری اینٹ کی بغیر چونہ و پلاسٹر کی عمارت ہے۔ دیوبند کی سرزمین میں یہ مسجد ابتدا سے مشائخ واکابر اہل اللہ کا مسکن اور قیام گاہ رہی ہے، کہا جاتا ہے کہ حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ نے اس مسجد میں چلہ کشی کی ہے، دیوبند کے مشہور بزرگ حضرت حاجی عابد حسینؒ کا قیام بھی اسی مسجد میں رہتا تھا، دارالعلوم کے قیام کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ جو دارالعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے، اس مسجد میں قیام پذیر رہے ہیں۔ غرضکہ یہ مسجد دیوبند کے اکثر اہل اللہ کی جائے قیام اور سرچشمۂ فیوض رہ چکی ہے، مسجد کے صحن میں انار کا وہ تاریخی درخت بھی اب تک موجود ہے، جس کے سایہ میں دارالعلوم کا مبارک آغاز عمل میں آیا تھا،

مسجد قاضی — شیخ ابوالوفا، عثمانی جو دیوبند کے شیوخ عثمانی کے مورث اعلیٰ ہیں اُن کے فرزند قاضی فضل اللہ ملقب بہ "شیر" نے یہ مسجد تعمیر کرائی تھی، عمارت نہایت سادہ بڑی اینٹ کی تھی، بوسیدہ ہوجانے پر ۱۳۱۰ھ میں حکیم مشتاق احمد صاحبؒ نے مسجد کو از سرِ نو بنوادیا ہے، افسوس کہ اس موقع پر سنگی کتبہ گم ہوگیا۔ اس لئے سنِ تعمیر کا پتہ نہیں چل سکا۔ حضرت سید احمد شہیدؒ جب دیوبند تشریف لائے تھے تو اسی مسجد کے ایک دالان میں قیام فرمایا تھا۔

مسجد قلعہ

سکندر شاہ لودھی نے اپنے زمانۂ حکومت میں بکثرت سرائیں، مدرسے اور مسجدیں بنوائیں، یہ بہت پابند شریعت اور علم دوست بادشاہ تھا، ہندوؤں نے اولاً فارسی زبان کی تعلیم اسی کے عہد حکومت سے شروع کی، دیوبند کی یہ مسجد اسی نیک دل بادشاہ کی یادگار ہے، عام خیال یہ ہے کہ قلعہ کے ساتھ ہی اس کی تعمیر عمل میں آئی تھی جیساکہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے قلعہ کے آثار معدوم ہو چکے ہیں البتہ مسجد صحیح اور قدیم حالت میں موجود ہے، اس کی صدر محراب میں باہر کی جانب سنگی کتبہ لگا ہوا ہے جس میں خط نسخ میں حسب ذیل عبارت تحریر ہے:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۞ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

بنا شد این مسجد جامع در عہدِ سلطنت سلطان سکندر شاہ بن سلطان بہلول شاہ خلد اللہ ملکہٗ بحقیر مسمیٰ کرم جہاں فیروز ملک محمد لطف اللہ خاں افغانان - فی التحریر رجب المرجب من سنۃ عشر وتسعمائۃ"

سنہ ۱۳۴۲ھ میں مسجد کے عقبی جانب اور سنہ ۱۳۵۸ھ میں صحن کی عمارت میں مزید اضافہ ہوا ہے، جس سے مسجد پہلے سے زیادہ وسیع اور کشادہ ہو گئی ہے۔

صحن میں حوض بھی مؤخر الذکر تعمیر کے زمانہ میں بن گیا ہے، عقبی جانب کی عمارت میں اس کے زمانۂ تعمیر کا کتبہ بھی نصب ہے جس میں لکھا ہے کہ:-

"درجۂ پیشین ایں جامع مسجد تعمیر سنہ ۶۱۶ھ/۱۲۱۹ء[۵] ہجری معلوم می شود، چنانکہ از کتبۂ عربی

---

۵ تعجب کی بات ہے کہ اس مسجد میں جو کتبہ نصب ہے اس کی تاریخ میں سخت اختلاف ہے۔ صاحبِ تاریخ سہارنپور نے بھی سنہ ۶۱۶ھ/۱۲۱۹ء ہی لکھا ہے، اور بعض لوگوں نے اس کو سنہ ۶۱۰ھ/۱۲۱۳ء بتلایا ہے حالانکہ یہ دونوں صحیح نہیں ہیں، یہاں یہ واضح رہنا ضروری ہے کہ کتبہ میں جس بادشاہ کے عہد سلطنت میں مسجد کا تعمیر ہونا ظاہر کیا گیا ہے وہ سکندر شاہ بن بہلول شاہ ہے، اس کا زمانہ سلطنت سنہ ۸۹۴ھ/۱۴۸۸ء سے سنہ ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء تک ہے، سنہ ۶۱۰ھ/۱۲۱۳ء یا سنہ ۶۱۶ھ/۱۲۱۹ء سکندر شاہ کا نہیں بلکہ شمس الدین التمش (سنہ ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء - سنہ ۶۲۳ھ/۱۲۲۶ء) کا عہد حکومت ہے، کتبہ میں سکندر شاہ کے نام کی صراحت ہونے کے بعد لازمی ہے کہ اُسی کے زمانہ حکومت (سنہ ۸۹۴ھ/۱۴۸۸ء - سنہ ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء) میں یہ مسجد تعمیر ہوئی ہے!

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سن مذکور کے پڑھنے میں اس قدر غلطی کیوں کر ہوتی رہی؟ اصل یہ ہے کہ سن کے اُبھرے ہوئے حروف امتداد زمانہ سے کسی قدر شکستہ ہو گئے ہیں اور یہی غلط فہمی کا سبب ہے، یہ کتبہ خط نسخ میں لکھا ہوا ہے۔ اور پتھر کی سطح کو تراش کر حروف نمایاں کئے گئے ہیں، خط بھی نہایت بھدا ہے بایں وجہ کتبہ کے حروف بمشکل پڑھے جاتے ہیں۔ اس لئے جس نے سنۃ ۶۱۶ھ پڑھا (جیسا کہ درجۂ پیشین اور تاریخ سہارنپور میں لکھا ہے)، اس نے "سنۃ عشر وتسعمائۃ" میں "سنۃ" (سن) کو "ستۃ" (۶) سمجھ لیا "تسعمائۃ" میں جو "تسع اور مائۃ" کو ملا کر لکھا ہوا ہے "ت" کا شوشہ نمایاں نہیں ہے اس لئے "تسعمائۃ" کی "ع" کی علامت کو "ستمائۃ" کی "ت" کا شوشہ تصور کر کے "ستۃ عشر وستمائۃ" سمجھ لیا گیا، اور جن لوگوں نے اس کو سنۃ ۶۱۰ھ پڑھا ہے وہ "سنۃ" کی غلطی سے تو محفوظ رہے مگر "تسعمائۃ" میں اُن کو بھی وہی غلط فہمی ہوئی ہے جو سنۃ ۶۱۶ھ پڑھنے والوں کو پیش آئی۔

پیشانی دروازۂ کلاں ظاہرست، سپس در دیوار قبلہ ۳ در مفتوح کردہ، در ۱۳۴۲ھ

این درجہ جدیدہ غربیہ کہ وسعت چہار صف متصل دارد، از چندۂ عام اہل اسلام حنفی

المذہب صورت تعمیر یافت ۔"

سنگ مرمر کا یہ کتبہ محراب کی بائیں جانب لگا ہوا ہے، داہنی جانب یہی عبارت عربی میں کندہ ہے

آدینی مسجد چھتہ، قلعہ اور اس مسجد کا نقشہ اور طرز تعمیر تقریباً ایک ہی قسم کا ہے، یہ مسجد شیخ معز الاسلام صاحب کی بنوائی ہوئی بتلائی جاتی ہے، مسجد کے متصل ہی ان کا مکان تھا جس میں اب انکا مزار ہے، مسجد سے ملحق جگہ محلہ "بڑے بھائیاں" کے نام سے موسوم ہے۔

"آدینی" کی وجہ تسمیہ یہ بیان کیجاتی ہے کہ اس مسجد میں پہلے نماز جمعہ ہوتی تھی اور چونکہ جمعہ کو فارسی میں آدینہ کہتے ہیں اس لئے آدینی مسجد کے نام سے موسوم ہو گئی،

۱۳۶۵ھ میں مسجد کی مشرقی جانب تعمیر میں مزید اضافہ ہوا ہے، تعمیر جدید کا جو کتبہ لگایا گیا ہے، اس میں تحریر ہے کہ

"یہ قدیم جامع عرف مسجد آدینی ابتدا ء آبادی قصبہ دیوبند سے قائم ہے، ۱۳۶۵ھ میں تعمیر میں مزید اضافہ ہوا "

گذشتہ بیانات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ دیوبند ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے بہت پہلے سے آباد ہے، لہذا ابتداء آبادی کے وقت مسجد کے تعمیر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ مسجد اسی وقت تعمیر ہوئی ہوگی جب مسلمانوں نے یہاں اقامت اختیار کی ہوگی، اور یہ زمانہ ساتویں صدی ہجری یا اس کے بعد کا ہو سکتا ہے، خود مسجد کے طرز

تعمیر سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے

مسجد خانقاہ یہ مسجد اکبر کے اوائل عہد حکومت کی یادگار ہے، جس محلہ میں یہ مسجد واقع ہے وہ شہر سے باہر شمال کی جانب واقع اور خانقاہ کے نام سے موسوم ہے، اس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، مسجد میں سنگ سرخ کا کتبہ لگا ہوا ہے، کتبہ کی پیمائش ۹ × ۱۵ - انچ ہے، عبارت کا رسم الخط شاہانِ افغان کے رسم الخط سے ملتا جلتا ہے، اس پر حسب ذیل عبارت کندہ ہے -

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۝ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

بنا شد این مسجد در عہد سلطان السلاطین نورۂ شہریاری ہر سپہر سلطنت و کامگاری شہنشاہ عادل ابو المظفر محمد جلال الدین اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ بسعی اہتمام فقیر حقیر مرزا بیگ ابن خواجہ علی محب بخشی، شہر صفر سنہ نہصد و شصت و پنج از ہجرت "

اس کتبہ میں اکثر باتیں تاریخی اعتبار سے اہمیت رکھتی ہیں، اس کی تاریخ ۹۶۵ھ ۱۵۵۷ء ہے جو اکبر کے سن جلوس کا تیسرا سال ہے، غالباً ہندوستان بھر میں عہد اکبری کا یہ کتبہ بقول مولوی عبد اللہ صاحب چغتائی، ان تمام موجودہ کتبات پر جواب تک معلوم ہوئے ہیں سبقت رکھتا ہے، کیونکہ امکاناً اکبر کے عہد کا کوئی قریب ترین کتبہ اگر ہو سکتا تھا تو اس کے پایۂ تخت آگرہ اور فتح پور سیکری میں پایا جاتا، مگر ان مقامات پر کوئی کتبہ ایسا اب تک دستیاب نہیں ہوا، جو اس کتبہ پر تقدم رکھتا ہو - اس کتبہ میں اکبر کی کنیت ابو المظفر کندہ ہے، حالانکہ دوسرے کتبات پر جو بعد کے ہیں "ابو الفتح" تحریر ہے، اکبر کی پہلی اختیار کردہ کنیت ابو المظفر کسی دوسرے کتبہ پر اب تک نہیں پائی گئی -

کتبہ پر مغلوں کے دور کے رسم الخط سے جو اکبر کے زمانہ میں رواج پذیر ہوا پہلے کا یعنی شاہانِ افغان کے زمانہ کا رسم الخط تحریر ہے

میرے نزدیک ایک یہ بات بھی اس مسجد کو اکبر کے عہد کی دوسری مسجدوں سے ممتاز کرتی ہے کہ یہ ویران نہیں ہے، میں نے اکبر کی بنوائی ہوئی اب تک جس قدر مسجدیں دیکھی ہیں ان کو عموماً ویران پایا ہے۔ اس مسجد کا گنبد اسی طرح حسین اور خوبصورت ہے جیسا کہ شاہجہانی عہد کی مسجدوں کے گنبد پائے جاتے ہیں۔

مسجد سرائے پیرزادگان یہ مسجد بھی قدیم التعمیر اور شہنشاہِ جہانگیر کے عہد کی یادگار ہے، الحاج سید محمد ابراہیم قدس سرہٗ کی خانقاہ کے ساتھ شاہی مصارف سے اس کی تعمیر عمل میں آئی تھی، سکھوں کی لوٹ مار اور آتش زدگی سے مسجد کو بھی سخت نقصان پہنچا تھا، سادات کے مشہور بزرگ حاجی محمد انور صاحبؒ نے قدیم بنیاد پر مسجد کو از سر نو تعمیر کرایا، اب مسجد میں جو کتبہ نصب ہے وہ دوسری تعمیر کا ہے جو ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء میں ہوئی ہے۔

مسجد عالم گیری عہد عالم گیری کی یہ مسجد شہر کی مغربی جانب محلہ ابوالمعالی میں واقع ہے، یہ مسجد ۱۰۷۸ھ / ۱۶۶۷ء میں شیخ عبدالرحمٰن بن شیخ چند اعثمانی کے اہتمام سے تعمیر ہوئی تھی، صدر دروازہ میں حسب ذیل عبارت کا کتبہ نصب ہے، مسجد وسیع اور کشادہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

بنا شد این مسجد در عہد سلطنت شاہنشاہ عادل سلطان السلاطین ابو المظفر محی الدین اورنگ زیب عالم گیر خلد اللہ ملکہ بسعی خان زمان جہانگیر علی خان بہ اہتمام شیخ عبدالرحمٰن ابن شیخ چند اعثمانی شہر رمضان سنۃ ثمان و سبعین بعد الالف ہجری النبوۃ ۱۰۷۸ ۔

جامع مسجد

اس جامع مسجد کی بنیاد حضرت حاجی سید محمد عابد صاحبؒ نے ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۷ء میں رکھی چار سال کے عرصہ میں بن کر مکمل ہوئی، اسی زمانہ میں دار العلوم کا قیام بھی عمل میں آیا تھا۔ یہ جامع مسجد نہایت وسیع، کشادہ اور عظیم الشان ہے، اس کے سر بفلک مناروں پر چڑھ کر شہر اور مضافات شہر کا منظر نہایت کیف آور معلوم ہوتا ہے، حدِّ نگاہ تک آم کے باغات کا خوش نما سلسلہ نظر آتا ہے۔

مسجد کی صدر محراب پر سنگ مرمر کے ٹکڑے پر حسب ذیل عبارت کندہ ہے

هو الله الواحد، رسول الله محمد صلی الله علیه وسلم و اسمائه

خلفاء بن الله موید مہتمم تعمیر صافی ضمیر حاجی محمد عابد صاحب

سلمہ ربہ ساعی ابن مسجد فقیر عبد الخالق دیوبندی عفی عنہ

صدیق باصفا عمر عادلِ امور عثمان باحیا، علی قاتل شرور

خواہی اگر زسال بنائے مسجد عظیم یابی مراد خود بحساب جمل عفور
۱۲۸۶ء

حاجی صاحبؒ نے موسس و مہتمم تعمیر کی حیثیت سے مسجد کے شمالی دروازہ پر مسجد کے انتظام سے متعلق ایک دستور العمل سنگ سرخ پر کندہ کرا کر نصب کرا دیا ہے، چنانچہ اسی کے مطابق نظم و نسق قائم ہے، مسجد کے زمانۂ تعمیر کے ایک اشتہار میں تعمیر مسجد کی تحریک کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ نے خواب میں دیکھا کہ اس مقام پر جہاں اب جامع مسجد واقع ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور آپ کے سامنے ایک تشت رکھا ہوا ہے جو دودھ سے بھرا ہوا ہے، داہنی جانب ایک شخص ہے جو روپیہ لا لا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے انبار لگا رہا ہے، آپ نے حاجی صاحبؒ سے ارشاد فرمایا

کر یہاں مسجد بنانا شروع کر دو"

اس زمانہ میں اس مقام پر لوگوں کے مکانات تھے،

اسی زمانہ میں مشہور واعظ مولانا عبدالرب دہلویؒ دیوبند تشریف لائے اور اپنے مواعظ میں جامع مسجد کی تکمیل کی تحریک کی، اہل شہر پر مولانا کے مواعظ کا بہت اثر ہوا مگر جب تعمیر کا تخمینہ لگایا تو کم و بیش ایک لاکھ روپیہ کا ہوا، اتنی بڑی رقم کا فراہم ہونا آسان نہ تھا، لوگ متحیر تھے، آخر ایک جگہ متعین کر کے سب لوگ رات کو جمع ہوئے اور بارگاہ رب العزت میں دعا کی، لوگوں میں تعمیر مسجد کا ایسا جذبہ پیدا ہو گیا کہ انھوں نے روپیہ کے علاوہ زیور، کپڑے، برتن، لکڑی، اینٹ اور چونہ غرض کہ جو جس سے بن پڑا اس نے لا کر رکھ دیا، حاجی صاحبؒ مہتمم تعمیر قرار پائے اور مولانا عبدالخالق صاحب تحصیل چندہ پر مامور کئے گئے مسجد کے مسقف درجے تین ہیں اور ہر ایک درجہ میں سات سات در ہیں اور تین تین گنبد ہیں، منارہ ہشت پہلو ہیں ہر منارہ میں چار درجے ہیں، روشنی اور ہوا کے لئے ہر ایک میں آٹھ آٹھ روشن دان ہیں، ہر منارہ میں سنگ سرخ کی سو سو سیڑھیاں ہیں، مناروں اور برجوں پر طلائی کلس چڑھے ہوئے ہیں، جو منشی ابوالحسن صاحب دیوبندی کی فیاضی کی یادگار ہیں، مسجد کے دالانوں میں تقریباً بارہ سو نمازیوں کی جگہ ہے۔

صحن کے اطراف میں قدیم طرز پر مدرسہ اور طلبہ کے لئے دالان اور حجرے بنائے گئے ہیں، دارالعلوم دیوبند اپنے ابتدائی چند سالوں میں اس جامع مسجد میں بھی رہا ہے، مگر جب اس کی روز افزوں ترقی کے باعث یہ جگہ ناکافی ثابت ہوئی تو وہ دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا۔ مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں اسی زمانہ میں ایک بزرگ سید جمعیت علی دیوبندی نے ایک طویل مثنوی لکھی تھی، اس میں مسجد کے حالات، مدت تعمیر، معماروں اور مزدوروں کی تعداد

ان کی یومیہ مزدوری، طرز تعمیر کی خصوصیات، مصارف کی تعداد وغیرہ، حاجی صاحبؒ کی انتظامی، اور مولانا عبدالخالق صاحب کی تحصیل چندہ کی خدمات نہایت تفصیل سے بیان کی گئی ہیں، حاجی صاحبؒ کی نسبت اسی مثنوی میں ایک شعر ہے ؎

پیر جی عاشق علی کے نور عین ‌ ‌ ‌ ‌ بانیٔ مسجد ہوئے عابد حسین

اس مثنوی میں جزئی جزئی واقعات تک کو نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے، یہ مثنوی چھ ہزار تین سو اشعار پر مشتمل ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند وہ اشعار جن میں تعمیر کی خصوصیات اور اس کا نقشہ بیان کیا گیا ہے یہاں پیش کر دیئے جائیں۔ ؎

دونوں بازو میں بنے مینار دو ‌ ‌ ‌ ‌ اُن پہ چڑھ کے قدرت حق دیکھ لو
چار درجے کے یہ دو مینار ہیں ‌ ‌ ‌ ‌ خوب صورت دونوں ہیں، پُر کار ہیں
ہے ہر ایک درجہ میں اک اک دسعیاں ‌ ‌ ‌ ‌ دونوں میناروں کے پیارے درمیاں
سیڑھیاں سو ہیں ہر ایک مینار کی ‌ ‌ ‌ ‌ ہوشیاری سے بہت پُر کار کی
سیڑھیاں ہیں سرخ پتھر کی یہاں ‌ ‌ ‌ ‌ درمیاں مینار کے ہیں وہ نہاں
دونوں اٹھ پہلو بنائے اے عزیز ‌ ‌ ‌ ‌ خوب صورت دیکھو گر کچھ ہے تمیز
نقش کاری کی ہر ایک درجہ پہ یاں ‌ ‌ ‌ ‌ غور سے دیکھو لگا کر اپنا دھیان
اوپر اُس نے جا کئے ہیں آٹھ در ‌ ‌ ‌ ‌ ہر پہل میں ہے، ہر ایک در جلوہ گر
ان کے اوپر برج ایک موزوں بنا ‌ ‌ ‌ ‌ نور کا اوپر چھتر اُن کے تنا
ایک کلس سونے کا ہے اُن پر لگا ‌ ‌ ‌ ‌ قدرت حق کا وہاں ہے جگمگا
درمیاں ہر در کے جنگلہ کر دیا ‌ ‌ ‌ ‌ ٹھہرنے کا وہاں پہ بنگلہ کر دیا

لکھتا ہوں اب درجہ درجہ کا بیاں ‏ تاکہ واقف اس سے ہو جا ہر جواں
تین برج ہیں پہلے درجہ پر میاں ‏ چار اگلے پر کئے اس نے نہاں
چار تو چھت کے برابر کر دیئے ‏ تین کو اونچا اٹھا کر کر دیئے
دوسرے درجہ پہ سات ہیں گے عیاں ‏ تین اونچے چار نیچے بے گماں
تین تو بس گول اونچے کر دیئے ‏ بس چو پہلو چار نیچے کر دیئے
تیسرے درجہ پہ بھی بس تین ہیں ‏ تیرہ ہیں لیکن بہت رنگین ہیں
درجہ سوئم پر بھی ہیں اوپر کئے ‏ مستری نے چھت کے چار ہم سر کئے

اندرونِ مسجد:

درجہ سوئم میں پنجی سات ہیں ‏ پچھلی جو دیوار ہے اس کے ساتھ ہیں
ہیں کمانچہ اندر اٹھارہ کر شمار ‏ بارہ چھوٹے چھ بڑے ہیں در شمار
ساتوں برجوں میں پنجی ایک سو چار ‏ کاریگر نے رکھی ہیں کر کے شمار
ہیں یہ گولائی میں سب پہچان لے ‏ تیرہ برجوں میں یہ سب ہیں جان لے
طاق کل مسجد میں بائیس ہیں عیاں ‏ اور نہ ۹ طاقڑی چھوٹی ہیں وہاں
مستری نے بیس ۲۰ روشن داں کئے ‏ روشنی آنے کے یہ ساماں کئے
کل نمازی بارہ سو آتے ہیں وہاں ‏ فضل ربی سے سماتے ہیں میاں

فرش

فرش پر موزوں مصلّے کر دیئے ‏ تیس چالیس تھوڑے دن میں بھر دیئے
ریخ کم معلوم ہوتی تھی عیاں ‏ ریخ کی، کاریگری سے تھی نہاں
غور سے معلوم ہوتا تھا نشاں ‏ چلتے جاتے جوڑ معلوم ہو کہاں

موزوں وہ پتھر لگائے فرش پر　　آفریں دیں تھے ملائک عرش پر

ڈاٹ

ڈالا ہے شہتیر ہر ایک ڈاٹ پر　　برج کے دَر کے ہے ڈاٹ اس گھاٹ پر
ایک کے ساتھ ایک کو سانٹھا ہے خوب　　ایک عجب انداز سے گانٹھا ہے خوب
بوجھ ہر شہتیر کا پھانٹا ہے خوب　　بہ طرز بہ انداز بس چھانٹا ہے خوب
ایک جا پر ہی نہیں برجوں کا بوجھ　　بوج ان کا کر گیا ہر جا پہ اوج
واقعی مضبوط سارا کام ہے　　ساری مسجد کا بخیر انجام ہے

مدارس

افسوس ہے کہ دیوبند کے قدیم تاریخی ذرائع مفقود ہونے کے سبب سے برطانوی عہد سے قبل کے مدارس کا کوئی سراغ نہیں ملتا، صرف اورنگ زیب کے زمانہ کے ایک فرمان سے جس کا ذکر پہلے بھی گذر چکا ہے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ سرائے پیرزادگان کی خانقاہ میں مدرسہ بھی تھا جس میں طلباء کی اس قدر کثرت تھی کہ اس زمانہ کے رواج کے مطابق دہلی کی مرکزی حکومت کو مدرسین کی معاش اور طلباء کے خورونوش کے مصارف کے لئے ایک بڑی جاگیر دینی پڑی تھی، اورنگ زیب ہی کے عہد میں اس زمانہ کے مشہور سیاح کپتان الیگزنڈر ہمٹن کے مطابق دارالسلطنت سی سیکڑوں میل کے فاصلہ پر صرف سندھ کے ایک شہر ٹھٹہ میں مختلف علوم و فنون کے چار سو مدرسے موجود تھے، دراصل اس زمانہ کی علمی تاریخ کو سمجھنے کے لئے اس نکتہ کا پیش نظر رہنا نہایت ضروری ہے۔ جس کے بغیر تاریخ کا کوئی طالب علم حقیقت تک

رسائی حاصل نہیں کر سکتا، وہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں علم آج کل کی طرح مدارس کے احاطہ، دیواروں اور ضوابط کی قید و بند میں مقید نہ تھا بلکہ مدارس کے لئے مستقل عمارتیں بنانے کے بجائے اس زمانہ میں زیادہ تر یہ کام مسجدوں کے صحن، خانقاہوں کے حجروں، امرار کی ڈھوڑیوں اور علمار کے مکانات اور وسیع میدانوں سے لیا جاتا تھا، تعلیم مفت ہوتی تھی، حتیٰ کہ غریب لڑکوں کے کھانے، کپڑے، اور لکھنے پڑھنے کی ضروریات بغیر کسی معاوضہ کے مہیا کی جاتی تھیں۔ علمار کے علاوہ امرا بھی جو عموماً صاحب علم و فضل ہوتے تھے، اپنے کاموں کے علاوہ درس و تدریس بھی ان کی زندگی کا عزیز ترین مشغلہ ہوتا تھا، منتخب التاریخ میں بدایونی نے لکھا ہے کہ "میر فتح اللہ شیرازی جو اکبر کے عہد میں وزارت کے منصب پر فائز تھا وقتاً فوقتاً طلبا، کو درس دیتا رہتا تھا، عربی صرف کی مشہور کتاب "علم الصیغہ" اور "تاریخ حبیب الہ" کے مصنف مفتی عنایت احمدؒ جو عدالت دیوانی میں منصف تھے، عدالت میں بھی شاگردوں کا مجمع ساتھ رکھتے تھے، دورانِ مقدمات میں جہاں ذرا فرصت ملتی درس شروع ہو جاتا تھا"۔

(استاذ العلما، ص ۵)

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ ساری عمر مطابع میں تصحیح کتب کا کام کرتے رہے، مگر اسی کے ساتھ ساتھ ہمیشہ درس و تدریس کی مجلس بھی گرم رہتی تھیں، (سوانح قاسمی ص ۲۰ و ۲۱)

اب بھی بکثرت ایسے علما موجود ہیں جنھوں نے گنگوہ کی خانقاہ قدوسی میں حضرت مولانا رشید احمدؒ سے علم حدیث کی تحصیل کی ہے۔

یہ تو گذرے ہوئے زمانہ کی چند مثالیں ہیں، خود ہمارے زمانہ میں بھی لڑکیوں کی

تعلیم کے لئے اس طرز کے بے شمار مکاتب کم و بیش ہر جگہ موجود ہیں، لکھے پڑھے مسلمانوں کی آبادی کا شاید ہی کوئی محلہ ایسا ہوگا جس کے گھروں میں لڑکیوں کے قرآن مجید کے متعدد مکاتب موجود نہ ہوں، ان مکاتب میں اُسی قدیم روش کے مطابق آج تک تعلیم مفت ہوتی ہے، مسجدوں میں اکثر و بیشتر ایسی عمارتیں بنائی جاتی تھیں جو طلباء کے درس و تدریس اور قیام کے کام میں آسکیں، چنانچہ اس زمانہ کی اکثر مساجد کے صحنوں کے اطراف میں حجروں اور دالانو کا وسیع سلسلہ نظر آتا ہے، دہلی میں مسجد فتح پوری جو شاہجہاں کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی اسی طرز کی قدیم یادگار ہے، مسجد فتح پوری کے وسیع صحن کے گرد جو حجرے اور دالان بنے ہوئے ہیں وہ آج بھی اس مقصد کو پورا کر رہے ہیں دیوبند کی جامع مسجد میں بھی اسی طرز پر حجرے اور دالان بنائے گئے تھے، اور جب تک دارالعلوم کی موجودہ عمارت تیار نہیں ہوئی تھی مسجد ہی سے دارالعلوم کا کام بھی لیا جاتا تھا،

غرض کہ اس طرح برطانوی عہد سے پہلے ملک میں مدارس کا جال بچھا ہوا تھا، اور گھر گھر علم کا چرچا رہتا تھا مسجدیں اور خانقاہیں اہلِ علم کی آوازوں سے ہر وقت گونجتی رہتی تھیں، یہی وجہ تھی کہ مدارس کے لئے مستقل عمارتیں بنانے کا رواج اس زمانہ میں بہت کم تھا۔

آخری زمانہ میں دیوبند میں قدیم طرز کے صرف تین مدرسوں کا پتہ چلتا ہے، ان میں سے ایک مدرسہ مولوی مہتاب علی کا تھا، دوسرا میاں جی امام علی کا، اور تیسرے میں جو مصر بحال سنگھ رئیس کے مکان پر جاری تھا، دیوبند کے مشہور بزرگ میاں جی منے شاہ صاحب پڑھاتے تھے ان مدرسوں میں ہندو اور مسلمان بچے ساتھ ساتھ پڑھتے تھے، نصاب تعلیم میں فارسی اور حساب داخل تھا، ان مدرسوں میں سے بعض کے تعلیم یافتہ اب بھی خال خال موجود ہیں، اگرچہ ان مدارس کی تعلیم آج کل کی طرح باضابطہ نہ تھی، مگر استادوں کا فیضانِ نظر شاگردوں میں غیر معمولی

قسم کی علمی پختگی اور اخلاقی درستگی پیدا کر دیتا تھا، جن لوگوں کو ان مدارس کے پڑھے ہوئے اشخاص سے واسطہ پڑا ہے وہ اس کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔

تحصیلی اسکول

دیوبند کے موجودہ مدارس میں سب سے قدیم مدرسہ تحصیلی اسکول ہے، یہ اسکول ۱۸۵۰ء/۱۲۶۶ھ میں اردو ہندی اور حساب کی تعلیم کے لئے مڈل کلاس تک کے لئے کھولا گیا تھا، اسکول کی عمارت تحصیل کے متصل واقع ہے، عام تحصیلی مدارس کی طرح اسکول کے مصارف کا تعلق ڈسٹرکٹ بورڈ سے ہے، تحصیلی اسکول کے علاوہ تین پرائمری اسکول ہیں جن میں چوتھی جماعت تک تعلیم کا انتظام ہے، ابھی کچھ عرصہ قبل تک ان مدارس میں اردو پڑھائی جاتی تھی، مگر بھارت کے دستور اساسی کی رُو سے چونکہ سرکاری اور دفتری زبان اُردو کے بجائے ہندی قرار پاچکی ہے، اس لئے اردو کو نصاب تعلیم سے خارج کر دیا گیا ہے،

انٹر کالج

مذکورہ بالا تحصیلی اور پرائمری اسکولوں کے علاوہ دیوبند میں انگریزی کا ایک انٹر کالج بھی ہے، یہ کالج بابو ہریت رائے آنجہانی کی علم دوستی کی یادگار ہے اور اپنے بانی ہی کے نام پر ہریت رائے انٹر کالج کے نام سے موسوم ہے، یہ ۱۹۰۶ء/۱۳۲۴ھ میں قائم ہوا تھا، اور اوّلاً صرف آٹھویں کلاس تک اس میں تعلیم ہوتی تھی، پھر رفتہ رفتہ ترقی کر کے میٹرک تک پہنچ گیا، اور اب چند سالوں سے انٹرمیڈیٹ تک ترقی کر گیا ہے، کالج کی جدید عمارت شہر کے شمال و مشرق میں ایک کھلے ہوئے میدان میں واقع ہے، یہ عمارت ہندو مسلمانوں کے مشترکہ سرمایہ سے تعمیر ہوئی ہے،

اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول

ہریت رائے انٹر کالج کے علاوہ بچوں کی انگریزی تعلیم کا کوئی مناسب انتظام نہ تھا، عالیجناب شیخ ضیاء الحق صاحب اور شہید مرحوم سید محمد محتشم صاحب کی متفقہ کوشش سے ربیع الاول ۱۳۶۶ھ

(جنوری ۱۹۴۷ء) میں کم سن مسلمان بچوں کی تعلیمی سہولت کے پیش نظر یہ اسکول جاری کیا گیا۔

ابتداً یہ اسکول آٹھویں کلاس تک تھا، مگر اپنے تعلیمی نتائج کی عمدگی کے باعث چند ہی سالوں میں انٹرنس تک پہنچ گیا ہے، مالی حالت قابل اطمینان نہ ہونے کے باعث اسکول کو متعدد مرتبہ موت وحیات کی کش مکش سے گذرنا پڑا ہے، اسکول کی عمارت بھی اپنی نہیں ہے، تاہم اس کا ہر قدم روز افزوں ترقی کی جانب گام زن رہا ہے، سائنس روم کے قیام کا بھی انتظام کیا جا رہا ہے۔

گرل اسکول لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ایک گرل اسکول بھی موجود ہے اس میں مڈل کلاس تک تعلیم کا انتظام ہے اس اسکول کی بھی اپنی عمارت نہیں اور اب تک کرایہ کے مکان میں چل رہا ہے۔

سنسکرت مہا ودیالیہ ہندو سنسکرت کا یہ ودیالیہ دیوی کنڈ کی عمارت میں واقع ہے اس کو ۱۹۱۵ء ۱۳۳۴ھ میں پریانند سرستی اور بیاس امی چند صاحبان نے ہندی اور سنسکرت کی تعلیم اور ہندو دھرم کی تبلیغ کے لئے قائم کیا تھا، اس میں مقامی طلباء کے علاوہ بیرونی طلباء بھی زیر تعلیم رہتے ہیں، غریب طلباء کو کھانا بھی ملتا ہے، ڈھائی سو من اناج سالانہ ان طلباء پر خرچ ہوتا ہے جو ودیالہ سے کھانا کھاتے ہیں، سالانہ مصارف کا تخمینہ تین ہزار روپے ہے، آمدنی کا ذریعہ عام چندہ ہے طلباء کی تعداد ایک سو کے لگ بھگ ہے۔

(یہ حالات "ہندو سنسکرت کا ایک کیندر" پمفلٹ سے ماخوذ ہیں)

دارالعلوم

دیوبند کو دارالعلوم کے باعث جو شہرت اور عظمت حاصل ہے۔ اس نے دیوبند اور دارالعلوم کو ایک دوسرے کا ہم معنیٰ بنا دیا ہے، اس لئے دیوبند کی تاریخ میں دارالعلوم کا ذکر گویا دیوبند ہی کی تاریخ ہے، اس بناء پر دارالعلوم کے حالات کو تفصیل سے پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا۔[1]

---

[1] دارالعلوم دیوبند کی اب تک کوئی مکمل اور مرتب تاریخ شائع نہیں ہوئی ہے، عرصہ ہوا میں نے تاریخ دیوبند کے سلسلہ میں دارالعلوم کے یہ حالات قلم بند کئے تھے، اسی دوران میں حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کو تاریخ دارالعلوم کی تدوین کا خیال پیدا ہوا، اور "قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند" راقم الحروف کو اس کام کے لئے مامور فرمایا،

تاریخ دارالعلوم کی تدوین جس قدر ضروری ہے، اسی قدر دشوار اور محنت طلب بھی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اب تک جن لوگوں نے اس سلسلہ میں قدم اٹھایا وہ راہ کی دشوار گذاریوں کی تاب نہ لاسکے، ان حالات میں نہیں کہا جاسکتا کہ میں کہاں تک کامیاب ہوسکوں گا موضوع کی عظمت، مواد کے منتشر ہونے اور وقت کی قلت کے باعث اگرچہ کام کی رفتار سست ہے، تاہم حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی توجہ اور نگرانی میں تاریخ دارالعلوم کا اب تک معتد بہ حصہ مدون ہوچکا ہے، اور یہ توقع ہوگئی ہے کہ بقیہ حصہ بھی اگر خدا کو منظور ہو تو جلد یا بدیر پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیگا۔ واللہ الموفق والمستعان!

یہ حالات دارالعلوم کی سالانہ شائع ہونے والی روددادوں سے اخذ کئے گئے ہیں، اس کے علاوہ جہاں کہیں دوسرے ماخذ سے مدد لی گئی ہے اس کا حوالہ دیدیا ہے، بعض باتیں روزمرہ کے حالات اور ذاتی مشاہدات پر مبنی ہیں "مم"

قدیم تعلیمی نظام کی تباہی

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے زوال سے قبل ملک میں جابجا مدارس موجود تھے خصوصاً دہلی، آگرہ، لاہور، ملتان، کشمیر، جونپور، لکھنؤ، خیرآباد، پٹنہ، اجمیر، دکن، مدراس، گجرات اور سورت وغیرہ بہت سے مقامات علم وفن کا مرکز تھے، مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد حکومت میں ملک کے تمام مدارس بجز فرنگی محل لکھنؤ کے سب تباہ و برباد ہو چکے تھے، کیونکر ہوئے اور کس طرح ہوئے؟ اس کا جواب خود اسی قوم کے افراد کی زبان سے سنیئے جس نے انکو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ اس وقت مسلمانوں کی تعلیم کا دار و مدار ان اوقاف اور معافیات پر تھا جو اسی مقصد کے لئے مسلمان امراء اور فرمانروا مخصوص کر جاتے تھے، ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر نے جو بنگال میں ایک بڑے سول عہدے پر فائز تھا ۱۸۷۱ء ۱۲۸۷ھ میں "ہمارے ہندوستانی مسلمان" نامی کتاب لکھکر اس سلسلہ کے حقائق کو سرکاری کاغذات سے واشگاف کر دیا ہے، ہنٹر لکھتا ہے کہ

> "صوبہ بنگال پر جب ہم نے قبضہ کیا تو اس وقت کے قابل ترین افسر مال (جیمز گرانٹ) کا بیان ہے کہ اس وقت صوبہ کی آمدنی کا تخمیناً ایک چوتھائی حصہ جو معافیات کا تھا حکومت کے ہاتھ میں نہیں تھا ۱۷۷۲ء ۱۱۸۵ھ میں وارن ہیسٹنگز نے ان علاقوں کی واپسی کی مہم شروع

---

[۱] ہندوستان میں قدیم اسلامی مدارس اور ان کے نظام تعلیم کی تاریخ جاننے کے لئے مولانا ابوالحسنات ندوی کی تصنیف "ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں" اور مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت" ملاحظہ ہوں! "م"

کی مگر ناکام رہی، ۱۷۹۳ء/۱۲۰۷ھ میں لارڈ کارنوالس نے پھر اس معاملہ کو اٹھایا مگر اس وقت کی طاقتور حکومت بھی اس پر قابو نہ پا سکی۔ پچیس برس بعد ۱۸۱۵ء/۱۲۲۹ھ میں حکومت نے پھر اس معاملہ کو زور سے اٹھایا مگر عمل کی جرأت نہ ہو سکی، آخر ۱۸۳۸ء/۱۲۵۴ھ میں آٹھ لاکھ پونڈ کے خرچ سے مقدمات چلا کر ان معافیات اور اوقاف تعلیم پر حکومت نے قبضہ پا لیا، صرف ان معافیات سے حکومت کی آمدنی میں تین لاکھ پونڈ یعنی تقریباً پینتالیس ۴۵ لاکھ روپے کا اضافہ ہو گیا۔"

(ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۲۵۵ و ۲۵۶)

اس کارروائی کا مسلمانوں کی علمی زندگی پر کیا اثر پڑا؟ اس کی نسبت ہنٹر لکھتا ہے کہ

"سینکڑوں پرانے خاندان تباہ ہو گئے اور مسلمانوں کا تعلیمی نظام جس کا دارومدار ان ہی معافیات پر تھا تہ و بالا ہو گیا، مسلمانوں کے تعلیمی ادارے ۱۸ سال کی مسلسل لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم مٹ گئے۔"

آگے چلکر لکھتا ہے کہ

"مسلمانوں کے اس الزام کا جواب نہیں دیا جا سکتا کہ ہم نے ان کے تعلیمی اوقاف کا ناجائز استعمال کیا، اس حقیقت کو چھپانے سے کیا فائدہ کہ مسلمانوں کے نزدیک اگر ہم اس جائداد کو جو اس مصرف کے لئے ہمارے قبضہ میں دی گئی تھی ٹھیک ٹھیک استعمال کرتے تو بنگال میں آج بھی ان کے پاس اعلیٰ اور شاندار تعلیمی ادارے موجود ہوتے۔" (ایضاً ص۲۵۷ و ۲۵۸)

اندازہ کیجئے کہ اسلامی حکومت میں جب صرف ایک ایسے دور افتادہ صوبہ میں جس کو اس زمانہ کے لحاظ سے کوئی تعلیمی فوقیت اور مرکزیت حاصل نہ تھی تعلیم کے لئے پینتالیس لاکھ روپے سالانہ آمدنی کے اوقاف موجود تھے تو ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں بالخصوص ان مقامات میں جن کو تعلیمی مرکزیت حاصل تھی کس قدر اوقاف ہوں گے؟ مسلمانوں کے قدیم نظام

تعلیم کو مٹا کر جو جدید نظام قائم کیا گیا، اس میں مسلمانوں کے مذہبی رجحان کی کس حد تک رعایت ملحوظ رکھی گئی تھی اس کو بھی ہنٹر ہی کی زبان سے سُنیئے، لکھتا ہے کہ

"ہمارے طریق تعلیم میں نوجوان مسلمانوں کے لئے مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے"

(ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۲۵۲)

بُرک اپنی اس یادداشت میں جو برطانوی گورنمنٹ میں پیش کی گئی تھی لکھتا ہے کہ

"ان مقامات میں جہاں علم کا چرچا تھا اور جہاں دور دور سے طالب علم پڑھنے کے لئے آتے تھے آج وہاں علم کا بازار ٹھنڈا پڑ گیا ہے" (بحوالہ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد ۱ ص ۲۹۲)

یہ حالات تھے جن میں ہمارے علماء کو یہ محسوس کرنا پڑا کہ سیاسی زوال و انحطاط اور حکومت سے محرومی کے ساتھ مستقبل میں مسلمانوں کا علم و مذہب اور قومی زندگی سخت خطرہ میں ہے وہ تاریخ کے اس فیصلہ سے بے خبر نہ تھے کہ جب کسی قوم نے کسی ملک کو فتح کیا، اور اس ملک کے باشندوں پر سیاسی غلبہ اور تسلط پایا ہے تو فاتح قوم کے اثرات و خصائص صرف مفتوح قوم کے جسموں تک محدود نہیں رہتے، بلکہ مفتوح قوم کے دل و دماغ اور علم و فکر بھی مسخّر ہو جاتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفتوح قوم اپنے ملّی شعائر، قومی خصائص اور فکر و عمل کو نہ صرف یہ کہ خیر باد کہہ دیتی ہے بلکہ "الناس علیٰ دین ملوکھم" کے اصول اور مدت تک جذب و کشش کا مسلسل عمل جاری رہنے کے باعث وہ آخر کار اپنی قدیم روایات سے نفرت کرنے لگتی ہے اور اس کے لئے صرف فاتح قوم کی نقالی اور کورانہ تقلید و اتباع ہی سرمایۂ افتخار رہجاتا ہے۔!

اس امر کے انسداد کے لئے اس وقت تعلیم کے سوا کوئی اور ایسی چیز باقی نہیں رہ گئی تھی جس کے ذریعہ سے مسلمان اپنے مذہبی شعائر اور قومی زندگی کا تحفظ کر سکتے، اور مغلوب

و محکوم ہونے کے باوجود بحیثیت مسلمان زندہ رہ سکتے، جہاں تک نفس تعلیم کے مسئلہ کا تعلق ہے اس میں تمام ارباب فکر متفق تھے، لیکن طریقۂ تعلیم میں اختلاف تھا، علما کرام کی رائے تھی کہ مسلمانوں کو صرف رائج الوقت اسلامی علوم و فنون کی تعلیم دی جائے جس کے ذریعہ وہ آئندہ اپنے قومی شعور کو برقرار رکھ سکیں ـــــ اس کے برخلاف دوسرے طبقہ کے نزدیک حکومت متسلط کی زبان اور علوم و فنون کا پڑھنا ضروری تھا، تاکہ اس کے ذریعہ سے ملک میں منصب اور عہدے حاصل کئے جا سکیں[1]۔ یہ رائے حکومت کی مقرر کردہ پالیسی سے قریب تر تھی، دونوں گروہ

---

[1] اس سے قبل تک ہندوستان میں جو تعلیمی نظام رائج تھا اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دینی علوم کے ساتھ بڑے سے بڑے ملکی اور فوجی منصب کے لئے طلباء کو تیار کرتا تھا، حتیٰ کہ ان ہی مدارس کے تعلیم یافتہ طلباء وزارت اور حکمرانی کے فرائض تک نہایت عمدگی اور قابلیت کے ساتھ انجام دیتے تھے، اور وہی شخص جو علوم دینیہ پر دسترس رکھتا تھا بڑے سے بڑے ملکی اور انتظامی منصب کے لئے اسی کی ضرورت پیش آتی تھی!

جدید نظام تعلیم کے جاری ہونے سے مسلمانوں کے تعلیمی نظام میں "قدیم" و "جدید" کے نام سے دو علمی طبقے پیدا ہو گئے، جس سے علم اور فکر و نظر کی سابقہ وحدت ختم ہو گئی اور قدیم طرز پر تعلیم پانے والوں کے لئے مملکتی انتظام و مسائل اور عام ملکی عہدوں اور منصبوں کی راہیں مسدود ہو گئیں، اب تمام منصب اور عہدے اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پانے والوں کے لئے مخصوص ہو گئے۔ صرف یہی نہیں کہ بلکہ جدید نظام تعلیم اپنے دامن میں جدید علوم و فنون بھی لیکر آیا تھا، سائنس نے معاشیات، اقتصادیات، عمرانیات اور سیاسیات وغیرہ وغیرہ علوم کے ذریعہ سے دنیوی زندگی کے ایک ایک گوشہ کو متاثر کر کے بالکل ایک نیا ماحول پیدا کر دیا اور رفتہ رفتہ حاکمانہ عظمت و اقتدار کی آغوش میں یہ علوم دنیا پر چھا گئے، مسلمانوں کے لئے "قدیم و جدید" اور دینی و دنیوی علوم کی یہ "تفریق" مفید ثابت ہوئی یا مضر۔؟ آج اس فیصلہ کیلئے ایک پوری صدی کے نتائج و ثمرات اور ان کے مفید و مضر پہلو وضاحت کے ساتھ ملک اور قوم کے سامنے آ چکے ہیں، "م"

اپنی اپنی جگہ کامیاب ہوئے، ملکی عہدوں اور منصبوں کے لئے اسکول اور کالج کھل گئے اور اسلامی علوم وفنون کے لئے مدارس عربیہ کا قیام ضروری سمجھا گیا، اس سلسلہ میں سب سے پہلے دیوبند میں دار العلوم کا قیام عمل میں آیا۔

دار العلوم کا قیام

۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء یوم پنجشنبہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا وہ مبارک ومسعود دن تھا جس میں انتہائی بے سروسامانی کے ساتھ صرف ایک طالب علم (شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ) اور ایک استاذ (حضرت ملا محمود صاحبؒ) سے چھتہ کی تاریخی مسجد کے کھلے صحن میں قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہٗ کی قیادت ورہنمائی اور حضرت حاجی عابد حسین، حضرت مولانا ذوالفقار علیؒ، اور حضرت مولانا فضل الرحمٰن رحمہم اللہ جیسی برگزیدہ شخصیتوں کے تعاون اور مشورہ سے اس درسگاہ کا آغاز کر دیا گیا، زیادہ عرصہ نہ گذرنے پایا تھا کہ یہ معمولی درسگاہ دنیائے اسلام کا مقبول ترین دار العلوم سمجھا جانے لگا، اور ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے گذر کر مختلف ممالک اسلامیہ کے طالبان علم بھی جوق در جوق اسلامی علوم وفنون کی طلب وتحصیل کے لئے اس میں جمع ہو گئے اور مختلف رنگ وبو کے پھولوں سے دار العلوم کا صحن معمور نظر آنے لگا۔

پہلے سال کے اختتام تک طلباء کی تعداد ۷۸ تک پہنچ گئی، جن میں دیوبند اور اس کے قرب وجوار کے علاوہ متعدد دُور دراز مقامات: مثلاً بنارس، پنجاب اور افغانستان کے ۵۸ طلباء شریک تھے، طلباء کے اضافہ کے ساتھ مدرسین کا اضافہ بھی ناگزیر تھا، چنانچہ آخر سال میں ۴ مدرس اور بڑھائے گئے، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہٗ کو صدارت تدریس تفویض کی گئی

مصارف کا جدید حل

یہاں یہ واضح رہنا چاہیئے کہ دارالعلوم کے قیام سے قبل تک (جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے) مدارس کے قیام اور ان کے مصارف کا ذریعہ امراء و سلاطین ہوا کرتے تھے جو اس مقصد کیلئے بڑی بڑی جائدادیں مخصوص کر دیتے تھے جو طلباء و اساتذہ کے علمی مصارف اور خورونوش وغیرہ اور دوسری ضروریات زندگی کی کفیل ہوتی تھیں، مگر دارالعلوم کا قیام جس وقت عمل میں آیا تو امراء و سلاطین کا دورہ گذر چکا تھا۔ اس لئے دارالعلوم کے مقدس اکابر نے اس کے قیام کے لئے غریب عوام کی جانب دست اعانت بڑھایا حضرت حاجی عابد حسین رحمۃ اللہ علیہ نے جو دیوبند کے ایک صاحب نسبت بزرگ تھے سب سے پہلے خود چندہ پیش کیا اور رومال بچھا کر بیٹھ گئے، حاجی صاحبؒ زبردست اثر و وجاہت کے مالک تھے، تھوڑی ہی دیر میں چار سو روپے جمع ہوگئے،

یہ قومی چندہ کی پہلی تحریک اور مفید بنیاد تھی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے والد ماجد حضرت مولانا فضل الرحمن صاحبؒ نے جو قیام دارالعلوم کی تحریک کے اولین حامیوں اور بانیوں میں سے تھے اس واقعہ کو ذیل کے شعر میں بیان کیا ہے ؎

مردِ حق عابد صداقت کیش   او لگستر اند رومالش

قومی چندہ کے ذریعہ مدرسہ قائم کرنے کی تجویز نہ صرف دارالعلوم کے لئے بلکہ عام قومی اداروں کے لئے نہایت مفید ثابت ہوئی، دارالعلوم کی اس مثال نے ملک کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیا، حصول سرمایہ کے لئے ہندوستان میں یہ پہلا تخیل تھا جو عملاً کامیاب ثابت ہوا اس "نسخہ کیمیا" کا ہاتھ آنا تھا کہ جا بجا اس کی تقلید میں مدارس جاری ہونے شروع ہو گئے

چنانچہ قیام دارالعلوم (۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۷ء) کے چھ سات ماہ کے بعد سہارنپور میں "مظاہر علوم" اسی اصول پر قائم ہوا، اور پھر رفتہ رفتہ جگہ جگہ مدارس جاری ہو گئے، عام قومی چندہ کی یہ کامیاب ترکیب ایسی عمدہ اور سہل تھی کہ ہر جگہ اس پر عمل کیا جا سکتا تھا، چنانچہ آگے چل کر یہ طریقہ اس قدر کامیاب اور مقبول ثابت ہوا کہ چند ہی سالوں میں مدارس عربیہ سے متجاوز ہو کر اسکولوں کالجوں، انجمنوں اور دوسرے اداروں تک عام ہو گیا، چنانچہ دارالعلوم کے قیام کے آٹھ نو سال بعد (۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۵ء) میں علی گڈھ کالج (مسلم یونیورسٹی) بھی اسی اصول پر قائم ہوا، اور پھر جوں جوں اس نظریہ کا تجربہ عام ہوتا گیا لوگوں کی ہمتیں بڑھتی گئیں اور آج بے شمار قومی اداروں کی بنیاد اسی نظریہ پر قائم ہے۔

دارالعلوم سے پہلے "اجتماعی اصول" پر مدارس و انجمن قائم کرنے، چندہ جمع کرنے، سالانہ روداد شائع کرنے اور عوام کو بصورت جلسہ جمع کر کے عملی نتائج دکھلانے کے طریقے سے لوگ واقف نہ تھے، دارالعلوم نے یہ مثالیں پیش کر کے ملک اور قوم کے لئے ایک نئی زندگی کا آغاز کر دیا۔

اہل دیوبند کی طلبا نوازی

اس موقع پر دارالعلوم کی تحریک کا اہل دیوبند نے اپنے عدم تمول کے باوجود جس گرم جوشی سے استقبال کیا اس کا اعتراف نہ کرنا بہت بڑی ناسپاسی ہوگی، پہلے سال میں ۵۸ بیرونی طلباء میں صرف ۶ طالب علم ایسے تھے جو خود اپنے اخراجات کا تکفل کر سکتے تھے، بقیہ ۵۲ طلباء کے خورد و نوش اور قیام وغیرہ کا تمام تر بار اہل دیوبند نے بخندہ پیشانی برداشت کیا سبقت الی الخیر کا یہ عمل بالیقین ان لوگوں کو "السابقون الاولون" کے

شرف سے ممتاز کرتا ہے۔

دیوبند میں شیوخ اور سادات مسلمانوں کے سربرآوردہ خاندان ہیں جو اپنی خاندانی شرافت کے علاوہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب تک دولت وتمول کے لحاظ سے بھی فائق اور ممتاز تھے۔

اگرچہ اس انقلاب کے بعد ان کی مالی حالت نہایت زبوں اور ناگفتنی ہوگئی تھی، مگر اس کے باوجود نہ صرف انھوں نے بلکہ دیوبند کے مسلمانوں کے ہر طبقہ و برادری کے لوگوں نے دارالعلوم کا یکساں گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا، اور ہر شخص نے اپنی بساط سے بڑھ کر دارالعلوم اور طلبا، کی امداد میں حصہ لیا۔

اور سچ تو یہ ہے کہ آج بھی باشندگان دیوبند اپنی اس دیرینہ خصوصیت میں پیچھے نہیں ہیں، چنانچہ ہر سال تقریباً ڈھائی تین سو طلبا، شہر کی مساجد اور دوسرے مقامات میں مقیم رہتے ہیں، ان کے قیام و طعام کا تکفل دیوبند کے غریب مسلمانوں کی علم دوستی اور طلبا، نوازی کا ایک ایسا ثبوت ہے جسے مسلمانوں کی علمی تاریخ میں فراموش نہیں کیا جا سکتا،[1] پھر یہ ایثار صرف فرائض سے عہدہ برآ ہونے

---

[1] اس بارہ میں دیوبند کے لوگوں کا طرز عمل شروع سے لیکر اب تک اس قدر مخلصانہ رہا ہے کہ وہ باوجودیکہ ہمیشہ دو تین سو بیرونی طلبا، کی ایک کثیر تعداد کی امداد و اعانت میں اپنے طور پر فرداً فرداً حصہ لیتے رہے ہیں اور انھوں نے ہمیشہ طلبا، کی ایک بڑی تعداد کے طعام و قیام وغیرہ کے مصارف کا بار برداشت کیا ہے، مگر بایں ہمہ دارالعلوم کے ذمہ دار ارکان کو اس بات کی باقاعدہ اطلاع دہی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ ۷۹ پر)

کی حد تک منحصر نہیں رہا بلکہ اس میں محبت بھی تھی اور شفقت بھی، قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نور اللہ مرقدہٗ نے تقسیم اسناد کے ایک جلسہ میں باشندگان دیوبند کے اس ایثار و قربانی کی تعریف کرتے ہوئے اپنی ایک تقریر کے دوران میں فرمایا تھا کہ

"سب دور و نزدیک کے رہنے والے جانتے ہوں گے کہ اس مدرسہ کی بنیاد دیوبند والوں نے ڈالی، اس امر میں وہ سب کے امام ہیں، ہر چند اور باہر کے صاحب اس کار خیر میں شریک ہوئے مگر جو کچھ ہے وہ دیوبند والوں ہی کا طفیل ہے، اور اس وجہ سے اگر یوں کہا جاوے کہ جتنا اور سب کو اس کار خیر کا ثواب ملیگا اتنا ہی تنہا دیوبند والوں کو ملے گا تو

(باقی حاشیہ گذشتہ صفحہ کا) ضروری نہیں سمجھتے، جہاں تک ایسے حضرات کے خلوص و للّٰہیت کے جذبہ کا تعلق ہے ان کا یہ رویہ یقیناً قابل تحسین و ستائش ہے مگر چونکہ ان کی عدم اطلاع سے دارالعلوم کے مالیہ کو بظاہر کوئی معتد بہ فائدہ نہیں پہنچتا اس لئے تحسین و ستائش کے باوجود اس کی مناسب اصلاح ضروری ہے، اسکی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ حضرات جو مساجد یا دوسرے مقامات میں مقیم طلباء کو کھانا دیا کرتے ہیں، یا ان کی دوسری ضروریات کی کفالت کرتے ہیں ان کو چاہیئے کہ وہ اپنی امداد کی نوعیت سے دارالعلوم کے ارکان کو مطلع کر دیا کریں، اس امر کی اطلاع دہی سے اُن کے اُخروی اجر میں اللہ کے نزدیک انشاء اللہ تعالیٰ کوئی کمی واقع نہیں ہوگی اور دارالعلوم بھی اپنے ایسے محسنین کے اسماء سے باخبر رہ سکے گا،

اگرچہ بعض حضرات کا یہ طرز عمل شروع سے اب تک رہا بھی ہے، جن کے اسماء رودادوں میں موجود ہیں، مگر ایسے لوگوں کا عدد اصل تعداد سے بہت کم ہے، اور یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہیں ہے کہ اصل تعداد کے لحاظ سے گویا ہے ہی نہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس مفید سلسلہ کو اس کی حقیقی حد تک وسیع کیا جائے!

"م"

عین مطابق قول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم من سن بالسنۃ حسنۃ فلہٗ اجرھا واجر من عمل بھا الیٰ یوم القیامہ ہوگا، واقعی اہل دیوبند نے وہ کام کیا ہے کہ قیامت تک صفحۂ روزگار پر ان کی یادگاری رہے گی، یہ نامی مدرسہ ہمیشہ ہمیشہ اہلِ دیوبند کی یادگاری کا باعث رہے گا، چونکہ اور اکثر مدارس اس مدرسہ کی دیکھا بھالی مقرر کئے گئے یا کئے جاتے ہیں تو کوئی مدرسہ اس سے ترقی کر جائے پر اہل عقل کے نزدیک وہ دیوبندی کا پرتو ہوگا اور اس پر جب یہاں کے باشندوں کی شکستہ حالی اور پریشان روزگاری پر نظر کی جائے تو پھر ان کی ہمت کی بات کسی طرح ان کاموں سے کم نہیں جو اہل سلطنت نے برفاہِ عام کئے ہیں، بایں ہمہ کھانے کی امداد میں طالب علموں کے ساتھ جو دل سوزی یہاں کے باشندوں نے کی وہ اتنی نہیں کہ ہم زبان سے ادا کریں فرشتوں نے اگر طالبان علوم کے قدم کے نیچے پر بچھائے تو انھوں نے ان کے سر پر دست شفقت رکھا، ماں، باپ کو بھلا دیا، دیوبند کو مثل گھر بنا دیا، یہ وہ خاص بات ہے جس میں شرکاءِ چندہ میں سے کوئی ان کا شریک وسہیم نظر نہیں آتا، اس کے عوض میں خداوند کریم یہاں کے باشندوں کو جزاءِ کامل عطا کرے، بالجملہ اس دولت بے زوال سے بدولت اہل دیوبند عالم مستفید ہے۔"

(رودادِ ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۴ء ص ۱۲)

بحمد اللہ اب سارے ہندوستان کے مسلمان دارالعلوم کی امداد و اعانت میں شریک ہیں اور ہر طبقہ کے لوگ یعنی والیان ریاست، زمیندار، تاجر، امراء، غرباء، ملازم اور علما وغیرہ سب اس کے معاونین اور چندہ دہندگان میں شامل ہیں، نیز ہندوستان سے گذر کر، پاکستان افغانستان، جنوبی افریقہ، برما اور انگلستان کے متعدد شہروں میں اس کے معاونینِ چندہ موجود ہیں، اور ہزاروں پونڈ سالانہ ان بیرونی ممالک سے دارالعلوم کو موصول ہوتا ہے،

ابھی ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء میں حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کے سفر افغانستان پر وہاں کی حکومت نے پچاس ہزار روپے افغانی کی پیش کش دارالعلوم کو کی تھی، اس سے پہلے ترکی کے خلیفۃ المسلمین سلطان محمد رشاد خاں اور فرماں روائے حجاز سلطان ابن سعود خلد اللہ ملکہٗ نے وقتاً فوقتاً بیش قیمت کتب کے ذخیرے دارالعلوم کے کتب خانہ کو عطا فرمائے ہیں۔

دارالعلوم کی روزافزوں ترقی

دارالعلوم کا تعلیمی اُٹھان شروع ہی سے بہت بلند اور نتیجہ خیز رہا ہے، ابھی اُس نے اپنی عمر کی دوسری ہی منزل طے کی تھی کہ اس میں ایسے طلباء تیار ہو گئے جو تدریسی خدمات انجام دے سکتے تھے، چنانچہ دارالعلوم کے ایک فاضل طالب علم سہارنپور کے مدرسہ مظاہر علوم میں مدرس مقرر کئے گئے طلباء کی تعداد پہلے ہی سال میں حیرت انگیز طور پر ۸۰ ہو گئی تھی، جس میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا، اور چند ہی سال میں چھتہ کی مسجد جس میں دارالعلوم کا آغاز ہوا تھا ناکافی ثابت ہونے لگی، اس لئے اولاً جامع مسجد میں جو اسی زمانہ میں تعمیر ہوئی تھی قدیم مدارس کے طرز کے مطابق دالان اور حجرے بنائے گئے، جس میں ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۴ء میں دارالعلوم منتقل کیا گیا، مگر بہت جلد یہ جگہ بھی ناکافی ثابت ہوئی تو قاسم العلوم حضرت مولانا نانوتویؒ نے دارالعلوم کے لئے آبادی سے باہر ایک کشادہ اور وسیع عمارت کی تجویز پیش کی۔ یہ تجویز عام طور پر پسند کی گئی اور اس کے لئے چندہ ہونا شروع ہو گیا،

کئی دن کے گشت و انتخاب کے بعد زمین کا ایک قطعہ جو دیوبند کے شمال و مغرب میں چھتہ کی مسجد کے قریب تھا خرید لیا گیا۔ یہ جگہ آبادی سے ملحق ہونے کے باوجود ایسی

تھی جس میں دار العلوم کے بڑھنے کے لئے کافی گنجائش تھی

دار العلوم کا سنگِ بنیاد

۲ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۶ء کو جمعہ کے دن جلسہ تقسیم انعام کے بعد دار العلوم کی موجودہ عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا، پہلی اینٹ حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوریؒ نے نصب فرمائی، پھر ایک ایک اینٹ حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ، حضرت حاجی عابد حسینؒ اور حضرت مولانا محمد مظہر صاحب کاندھلوی نے رکھی، اس وقت دیوبند کے اطراف وجوانب کا بہت بڑا مجمع موجود تھا، سب لوگوں نے نہایت خضوع وخشوع اور الحاح وزاری کے ساتھ دار العلوم کی بقا کے لئے دعا کی، حضرت نانوتویؒ نے فرمایا کہ

"عالم مثال میں اس مدرسہ کی شکل ایک معلق ہانڈی کے مانند ہے، جب تک اس کا مدار توکل علی اللہ پر رہے گا یہ مدرسہ ترقی کرتا رہے گا۔"

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے "تاریخ تعمیر کا مادہ "اشرف عمارات" سے نکالا" "اشرف عمارات" کے اعداد بحساب ابجد ۱۲۹۳ آتے ہیں، سنگ بنیاد ۲ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۶ء کو رکھا گیا تھا، مگر چونکہ تعمیر کا کام سال آئندہ میں شروع ہوا، اس لئے ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۷ء کو آغاز تعمیر قرار دیا گیا، پانچ سال کی مدت میں یہ عمارت "نودرہ" کے نام سے بن کر تیار ہوئی، اس کے دو درجے ہیں اور ہر ایک درجہ میں نو نو دروازے ہیں۔ دار العلوم کی یہ سب سے پہلی عمارت ہے اس کی تعمیر نہایت سادہ مگر پُرکار اور شاندار ہے، حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ جن کے زمانۂ اہتمام میں نودرہ تعمیر ہوا تحریر فرماتے ہیں کہ "اس میں سادگی اور استواری کو مقدم رکھا گیا ہے اس کا نقشہ من جانب اللہ قلوب میں الہام ہوا تھا۔"

خود حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رح نے نودرہ کی تعمیر شروع ہونے سے قبل خواب

خواب دیکھا کہ

"اس مقام پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ "یہ احاطہ تو بہت مختصر ہے" یہ فرما کر خود عصائے مبارک سے ایک طویل و عریض نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ ان نشانات پر تعمیر کی جائے، چنانچہ اُن ہی نشانات پر بنیاد کھدوا کر تعمیر شروع کرائی گئی"

اسی احاطہ میں وہ کنواں ہے جو نودرہ کے ساتھ بنا تھا، یہ کنواں دارالعلوم اور دیوبند میں بڑا بابرکت سمجھا جاتا ہے، اس کا پانی نہایت ٹھنڈا اور شیریں ہے، مولانا رفیع الدین صاحبؒ ہی نے ایک خواب میں یہ بھی دیکھا تھا کہ

"کنواں دودھ سے بھرا ہوا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیالہ سے دودھ تقسیم فرما رہے ہیں، بعض لوگوں کے پاس چھوٹے برتن ہیں اور بعض کے پاس بڑے، ہر شخص اپنا اپنا برتن دودھ سے بھروا کر لے جا رہا ہے"

مولاناؒ نے برتنوں کے چھوٹے اور بڑے ہونے کی یہ تعبیر فرمائی کہ اس سے ہر شخص کا "ظرفِ علم" مراد ہے، جس کا جتنا ظرف ہے اسی قدر علم اس کے نصیب و حصہ میں آئے گا۔

مسجد دارالعلوم ۱۳۲۷ھ / ۱۹۱۰ء میں دارالعلوم کے مقدس اکابر نے مسجد کی بنیاد کی دیواریں خود اپنے مبارک ہاتھوں سے تعمیر کیں، روداد میں سنگ بنیاد کی تقریب کی نسبت تحریر ہے۔

"طلباء کے عام مجمع میں بزرگان دین نے مسجد کی بنیاد رکھی، اور پھر ہر ایک طالب علم نے اپنے اپنے ہاتھ سے اینٹیں رکھیں، اور نہ صرف اینٹیں رکھیں بلکہ اس دیوار کی کل بنیاد جو بہت گہری تھی طلباء نے خود اپنے ہاتھوں سے بھری، طلباء کے ساتھ کل مدرسین و اراکین مدرسہ نہایت ذوق و شوق سے خود اینٹیں اپنے سروں اور ہاتھوں پر لاتے تھے، اور بجائے

معماروں کے تعمیر کرتے تھے

سبحان اللہ طلباء کا جوش مسرت کے ساتھ سنت خلیل اللٰہی میں مشغول ہونا اور ساتھ میں رجزیہ اشعار اور تعمیر بیت اللہ کے وقت کی حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی دعائیں پڑھنا عجیب مؤثر اور پرجوش سماں تھا۔"

مسجد کی تعمیر سیٹھ غلام محمد اعظم صاحب کی تنہا فیاضی کی یادگار ہے، مسجد کی رُوکار اور منار سنگ سرخ کے ہیں، جن پر نہایت حسین و دلآویز نقش ونگار کندہ ہیں، صحن مسجد میں مرمر کا سنگین حوض ہے، جو ہر وقت شفاف پانی سے لبریز رہتا ہے، اس میں پانی برقی موٹر کے ذریعہ سے بھرا جاتا ہے یہاں پنجگانہ اوقات میں نمازیوں کی کثرت اور ہجوم کو دیکھکر جمعہ وعیدین کا سماں نظر آتا ہے، مسجد کی روکار میں سنگ مرمر کا کتبہ نصب ہے جس میں مندرجہ ذیل اشعار کندہ ہیں

در مدرسہ مسجدے بنا شد ‏— ‏ایں مژدہ ز دوستاں شنیدم

برلوح جبینش اسم اعظم ‏— ‏خواندم چو بصحن او رسیدم

در سجدۂ شکر چوں فتادم ‏— ‏در گوش ایں شنیدم

مقروں شدہ عبادت و علم ‏— ‏در مدرسہ خانقاہ دیدم

۱۳ ۲۸ ھ ‏— ‏۱۳۲۸ ھ

یہ مسجد دو منزلہ ہے بالائی منزل ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۱ء کی تعمیر ہے۔

دار العلوم کی پر شکوہ اور خوش منظر عمارت کے اس گوشہ میں جو ریلوے اسٹیشن کو شہر سے ملانے والی سڑک کے آخری سرے پر واقع ہے اور جس سے آنے والے کو دار العلوم کے مشرقی دروازہ میں داخل ہونے پر سب سے پہلے جو عمارت ملتی ہے وہ دار العلوم کی یہی دو منزلہ خوش نما مسجد ہے، مسجد کی مشرقی جانب بالائی منزل پر دار الافتاء کی عمارت واقع

ہے، جو تین وسیع کمروں اور ایک کشادہ دالان پر مشتمل ہے۔

دار الحدیث جس طرح دار العلوم دیوبند کو یہ شرف و امتیاز حاصل ہے کہ ہندوستان بھر میں یہ پہلی درسگاہ ہے جو عین اسلامی علوم کے زوال کے وقت جمہور مسلمانوں کے عام چندے سے قائم ہوئی اسی طرح اس کو یہ تقدم و فضیلت بھی حاصل ہے کہ دار العلوم کا دار الحدیث ہندوستان بھر میں پہلی عمارت ہے جو اس نام سے عالم وجود میں آئی، اس میں شک نہیں کہ اسلامی عہد کے ہندوستان میں چپہ چپہ پر مدارس کا جال بچھا ہوا تھا اور ایک ایک ذرہ علم کی روشنی سے منور تھا۔ لیکن مدارس کی اس کثرت و بہتات کے باوجود ہندوستان میں کوئی عمارت دار الحدیث کے نام سے اس سے پہلے نہیں بنی!

اسلام کی تاریخ میں دار الحدیث کے نام سے پہلے پہل عمارت بنانے کا شرف شام کے فرمانروا ملک عادل نور الدین زنگی متوفی ۵۶۹ھ ۱۱۷۴ء کو حاصل ہے، سلطان ممدوح نے یہ دار الحدیث دمشق میں تعمیر کرایا تھا، دوسرا دار الحدیث قاہرہ (مصر) میں سلطان صلاح الدین فاتح بیت المقدس کے بھتیجے ملک کامل نے قائم کیا[1]، اور پھر یہ سلسلہ اس قدر پھیلا کہ صرف ایک شہر دمشق میں بیک وقت ۱۸ دار الحدیث موجود تھے جن میں ہر ایک بجائے خود زبردست عظمت و شان کا مالک تھا۔

دار العلوم میں دار الحدیث کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں ۲۰ ربیع الآخر ۱۳۳۰ھ ۱۹۱۲ء کو ایک عام جلسہ منعقد کیا گیا، جس میں ملک کے مختلف مقامات کے لوگوں نے کثرت سے شرکت کی، طلباء نے باصرار مزدوروں کے بجائے نہایت ذوق و شوق

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے کتاب الخطط مقریزی اور حسن المحاضرہ سیوطی جلد ۲ ص ۱۵۹

کے ساتھ والہانہ انداز میں خود بنیاد کھودی، حضرت تھانویؒ نے مجمع سے فرمایا کہ

"سب صاحب ایک ایک، دو، دو اینٹ اپنے ہاتھ سے رکھ دیں، نہ معلوم حق تعالیٰ کے ہاں کس کا خلوص مقبول ہو جائے"۔

چنانچہ تمام شرکا رجلسہ نے دو دو اینٹیں رکھیں[۱]۔

---

[۱] دارالحدیث کی تعمیر سے قبل مختلف حضرات نے عالم خواب میں دیکھا کہ موقع تعمیر دارالحدیث پر دارالعلوم کے اکابر مرحومین جمع ہیں اور خود اپنے ہاتھوں سے سامان تعمیر اٹھا اٹھا کر لا رہے ہیں اور تعمیر میں مصروف ہیں، اسی زمانہ میں ریاست ٹونک سرونج کے رہنے والے ایک صاحب، سید یوسف علی، ٹونک میں دارالحدیث کے لئے چندہ جمع کر رہے تھے، انھوں نے ایک نہایت مبارک خواب دیکھا، جو انھیں کے الفاظ میں درج ذیل ہے موصوف لکھتے ہیں کہ

"گذشتہ نصف شب کے بعد میں نے بعالم خواب دیکھا کہ میں بسواری ریل ٹونک جا رہا ہوں، ایک کف دست ریگستانی مقام میں یکایک ریل ٹھہر گئی، ایک شخص میرے پاس آئے اور کہا اترو، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہاں تشریف فرما ہیں، میں بکمال شوق ان کے ہمراہ ہو گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک جگہ چند مکان سرکی کے اور دو تین خیمے استادہ ہیں، میں پہلے سرکی والے مکان میں گیا وہاں چند حضرات تشریف فرما تھے، ان میں سے ایک صاحب نے جو کسی قدر فربہ اندام اور کچھ سیاہ فام تھے پیشانی پر سجدہ کا نشان تھا، کرتہ کی گھنڈی کھلی ہوئی تھی اور چند مجلد چرمی کتابیں ان کے پاس رکھی ہوئی تھیں، مجھ سے فرمایا کہ اول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں جاؤ! میں نے عرض کیا کہ کیا حضور مجھ کو خیمہ کے اندر بلوالیں گے؟ فرمایا ہاں! میں سلام کر کے خیمہ مبارک پر پہنچا، دروازہ پر

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دارالحدیث کی یہ پُر شکوہ عمارت بہمہ وجوہ ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۱ء میں مکمل ہوئی، یہ طویل وعریض اور سربفلک عمارت نودرہ کی پشت پر واقع ہے، دارالحدیث دو حصوں پر منقسم ہے، نودرہ کی پشت پر جو عمارت ہے قدیم دارالحدیث یہی ہے، مگر آج کل اس میں درس حدیث کے بجائے دوسری مختلف جماعتیں پڑھتی ہیں، دارالحدیث کے گردوپیش ۱۳ کمرے ہیں جو درس کے کام میں آتے ہیں، دارالحدیث کا طول ۸۰ فٹ اور عرض ۳۵ فٹ ہے اس کی روکار مغرب کی جانب ہے، اب حدیث کا درس اس عمارت میں ہوتا ہے جو نودرہ کے اوپر واقع ہے اور "دارالحدیث فوقانی" کے نام سے موسوم ہے، یہ عمارت ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۴ء کی تعمیر ہے۔

دارالتفسیر | قدیم دارالحدیث کے اوپر دارالتفسیر کی مربع عمارت ہے، یہ طول وعرض

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۸۹ کا) یاد نہیں کہ پردہ تھا یا نہیں، مجھ کو باریابی نصیب ہوئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر میری جانب دست مبارک بڑھائے، میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں لیکر بوسہ دیا اور روتا رہا، بیٹھنے کا حکم صادر ہوا، میں بیٹھ گیا، ہنس کر فرمایا! تم نے کس قدر چندہ وصول کیا ہے؟ میں نے عرض کیا ۶۲ روپے، پھر ارشاد ہوا کچھ پڑھو! میں نے سورۂ فاتحہ سنائی، فرمایا کہ "قرآن مجید صحیح پڑھا کرو!"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب دو صاحب اور تھے، ایک پورے قد آور جوان، خوب صورت چہرہ، سرخ وسفید رنگ، داڑھی سینہ تک، بال سیاہ وسفید، دوسرے صاحب لانبے، لاغر جسم، ان کا پورا حلیہ یاد نہیں رہا۔"

اس خواب کو نقل کرکے موصوف لکھتے ہیں کہ

"قبل ازیں مجھکو دو مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی، لیکن خاص صورت مبارک میں اس مرتبہ کی زیارت چندہ دارالحدیث جس کی بابت میں کوشاں ہوں اس کا خاص سبب ہے۔" ۱۲

(رسالہ القاسم صفحہ ۲ بابت ماہ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء)

میں ۳۰×۳۰ فٹ ہے۔ اس کے اوپر نہایت خوش نما گنبد بنا ہوا ہے جو اپنی رفعت عظمت اور حسنِ تعمیر کے لحاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا دار العلوم کے سر پر تاج رکھا ہوا ہے، دار التفسیر ۱۳۵۸ھ ۱۹۳۹ء کی تعمیر ہے دار الحدیث اور دار التفسیر کی یہ سر بفلک عمارت بہ ہیئت مجموعی اس قدر عظیم الشان اور پر شوکت ہے کہ دیکھنے والا غرق حیرت ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اس کا آسمان سے باتیں کرنے والا گنبد میلوں سے نظر آتا ہے،

دار جدید

دار الحدیث کے سامنے جدید دار الاقامہ ہے جو بڑے بڑے ۱۱۴ کمروں پر مشتمل ہے دار جدید کے کمروں کا سلسلہ دار الحدیث کی شمالی جانب سے شروع ہو کر مستطیل شکل میں مغرب سے گذرتا ہوا جنوبی سمت تک چلا گیا ہے کمرے وسیع اور کشادہ ہیں اور سب کے سامنے برآمدے ہیں، اس احاطہ کے شمال و جنوب اور مغرب میں تین دروازے ہیں، مغربی دروازہ جو عین دار الحدیث کے مقابل ہے "باب الظاہر" کے نام سے موسوم ہے۔ دار جدید کا یہ احاطہ دار العلوم کا سب سے زیادہ پُر فضا مقام ہے، کئی ایکڑ زمین کا نہایت وسیع صحن ہے جس کی تین سمتوں میں دار الاقامہ اور مشرقی جانب دار الحدیث ہے، دار جدید میں دو کشادہ سڑکیں ہیں، ایک دار الحدیث سے شروع ہو کر باب الظاہر پر ختم ہوتی ہے۔ اور دوسری سڑک شمالی دروازہ سے نکل کر جنوبی دروازہ میں گم ہو جاتی ہے ان سڑکوں نے دار جدید کے احاطہ کو چار قطعوں میں تقسیم کر دیا ہے، ان قطعوں میں رنگ برنگ کے پُر بہار اور جاذب نظر پھولوں اور قسم قسم کے چھوٹے بڑے درختوں کی چمن بندی کی گئی ہے جس نے منظر میں ایک ایسی دل کشی پیدا کر دی ہے جو بے ساختہ دیکھنے والے کو اپنی جانب کھینچتا ہے، ہری بھری گھاس سے پورا احاطہ خوش منظر اور شاداب نظر آتا ہے۔

باب الظاہر باب الظاہر دارِ جدید کا صدر دروازہ ہے، یہ دروازہ دار العلوم کی ایک نہائت خوشنما اور عالیشان عمارت ہے، ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء میں اس کی تعمیر ہوئی باب الظاہر موجودہ تاجدار افغانستان اعلیٰ حضرت المتوکل علی اللہ محمد ظاہر شاہ کے گراں قدر شاہانہ عطیہ اور دار العلوم سے وابستگی کی ایک ایسی یادگار ہے جو تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

دار القرآن دارِ جدید کے جنوبی گوشہ میں دار القرآن کی عمارت ہے جو کولوٹولہ کلکتہ کے مشہور تاجر الحاج فیروز الدین صاحب کی فیاضی اور خدمت قرآن کی یادگار ہے، یہ عمارت پانچ کمروں پر مشتمل ہے، اس میں ہر سال کم و بیش دو سو بچے قرآن مجید پڑھتے اور حفظ کرتے ہیں ۱۳۶۸ھ/۱۹۴۹ء میں اس کی تعمیر ہوئی۔

طلباء، اساتذہ، عملہ، اور آمد و صرف

دار العلوم میں کم و بیش ڈیڑھ ہزار طلباء ہر سال زیر تعلیم رہتے ہیں، دُور، دُور کی علمی اولادیں اُس کی آغوشِ درس میں تربیت پا رہی ہیں اور مختلف رنگ و بو کے پھولوں سے اس کا دامن پُر ہے۔

چھوٹی بڑی ۳۷ درس گاہیں ہیں، جن میں اہم اساتذہ درس و تدریس میں ہمہ تن مشغول رہتے ہیں، طلباء کے قیام کے لئے ۲۱۰ اقامت خانے ہیں، جن میں تقریباً آٹھ سو طلباء مقیم رہتے ہیں، تعلیم اور انتظامی لحاظ سے ۱۸ شعبے ہیں، جن میں ۱۰۸ اکارکن کام کرتے ہیں۔ ۱۲ مستقل دفاتر ہیں۔

طلباء کی تعداد ۱۳۶۶ھ میں بیرون ہند اور غیر منقسمہ ہندوستان

کے ۲۴۴ طلبا، حسب تفصیل ذیل زیر تعلیم تھے،

بیرونِ ہند

۱	جنوبی افریقہ	۴	۱۱	خوقند	۲	۲۱	کریہ	۱
۲	ملایا	۵	۱۲	سیبی	۱	۲۲	باجوڑ	۱
۳	مشرقی ترکستان	۱	۱۳	مرغینان	۱	۲۳	ٹوچی ایجنسی	۱
۴	ایران	۲	۱۴	نوشکی	۱	۲۴	سراوان	۲
۵	ختن	۱	۱۵	افغانستان	۲۷	۲۵	صوات	۲
۶	سرباز	۵	۱۶	مکران	۱۰	۲۶	تندوسر	۱
۷	ژوب	۱	۱۷	قرات گین	۱	۲۷	سیلون	۴
۸	بدخشان	۲	۱۸	چارکار	۵		میزان	
۹	زنگی آباد	۱	۱۹	وزیرستان	۳			
۱۰	فرغانہ	۱	۲۰	الیچہ وگرویز	۱۰			۹۶

غیر منقسم ہندوستان

۱	صوبہ سرحد	۱۵۴	۴	پنجاب	۱۰۱	۸	بہار، سی، پی	۴۴
۲	بلوچستان اور کوئٹہ	۲۰	۵	یوپی	۴۵۷	۹	سندھ، بمبئی، مدراس	۳۳
			۶	بنگال	۲۹۹		ریاستہائے ہند	۵۶
۳	قلات	۷	۷	آسام اور برما	۱۳۸		میزان	۱۳۴۶

درجات کی رو سے ان طلبار کی تفصیل یہ ہے۔

۱	درجات عربی	۱۱۶۰	۳	درجۂ قرآن مجید	۱۶۳
۲	درجات فارسی	۹۷	۴	درجۂ تجوید	۲۲

نتیجۂ امتحان سالانہ

اس سال کے امتحان سالانہ میں منجملہ ۱۴۴۲ طلبار کے ۱۳۲۶ طلبار شریک امتحان ہوئے ان میں ۱۲۹۷ کامیاب ۱۷ ناکام، اور ۱۵ غیر حاضر رہے، جس کے یہ معنیٰ ہیں کہ نتیجہ ۹۸.۷۱ فی صد رہا، جو کامیابی کا اعلیٰ ترین معیار ہے!

وظیفہ یاب طلباء

طلبار کی متذکرہ بالا تعداد میں وظائف و امداد پانے والے طلبا ۷۰۰ تھے اور ۷۴۲، اپنے اخراجات کے خود کفیل تھے،

اوسط مصارف فی طالب علم

سال زیر بحث کی آمدنی ۲،۶۲،۵۸۳ روپے ۱۰ آنے ۴ پائی تھی، اس میں طلبار پر جو رقم صرف ہوئی اس کی تعداد ۱،۴۱،۵۱۶ روپے ۴ آنے ۴ پائی ہے، ۳۰،۱۳۴ روپے ۸ آنے ۶ پائی تعمیر پر صرف ہوئے اور بقیہ روپیہ اساتذہ اور کارکنوں کی تنخواہوں اور دوسری ضروریات پر خرچ ہوا۔

مصارف طلبار کی رقم کو اگر اس سال کے ۱۴۴۲ طلبار پر تقسیم کیا جائے تو ۹۸ روپے ۲ آنے ۳ پائی فی کس اوسط نکلتا ہے، یہ ایک طالب علم کے سال بھر کے جملہ مصارف ہیں جس میں اس کے خور و نوش، کپڑا، جوتہ، روشنی، صفائی، اور معالجہ وغیرہ کے جملہ اخراجات شامل ہیں، گویا ۸ سال کی مدت میں جو درجات عربی کی مدت تعلیم ہے، ۷۸۵ روپے کا اوسط ہے، جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ دار العلوم نے آٹھ سو روپے سے بھی کم میں ایک ایسا

مکمل عالم تیار کر دیا جو مسلمانوں کی دینی ضرورتوں، تدریس و تبلیغ، وعظ و تقریر، تصنیف و تالیف، افتاء، اور مناظرہ وغیرہ کے کاموں کو باحسن وجوہ انجام دے سکتا ہے،

غالباً دنیا کی کسی بھی درس گاہ میں اس قدر قلیل ترین مصارف میں اس معیار کے حصول علم کی مثال موجود نہیں ہے، ! پھر نہ صرف یہ بلکہ فضلائے دارالعلوم میں آپ کو ایسی ایسی شخصیتیں بھی کچھ کم نظر نہیں آئیں گی کہ جن پر اگر ہزاروں روپے کی رقم بھی محض ان میں سے کسی ایک پر ہی نچھاور کر دی جاتی تب بھی یہ سودا گراں ثابت نہ ہوتا[۱] ! حضرت

---

[۱] اس موقع پر امام مالکؒ کے استاذ امام ربیعۃ الرائے کا واقعہ بے ساختہ زبان قلم پر آگیا، اس واقعہ سے مسلمانوں کے علمی ذوق اور قدر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

امام ربیعۃ الرائےؒ جلیل القدر تابعی گذرے ہیں، فقہ میں خاص امتیاز حاصل تھا، یہ بطنِ مادر میں تھے کہ ان کے والد فروخؒ سلطنت کی جانب سے خراسان کی مہم کا افسر بنا کر بھیجے گئے، یہ اسلامی فتوحات کے شباب کا دور تھا، لوگ تبلیغ اسلام کی روح سے سرشار تھے، فروخ کو اس مہم میں ۲۷ برس لگ گئے، اس عرصہ میں ربیعۃ الرائے پیدا ہوئے اور علم دوست ماں کی آغوش تربیت میں جوان ہوئے، فروخ نے سفر پر جاتے ہوئے ۳۰ ہزار اشرفیاں جو اُن کی عمر کا اندوختہ تھیں بیوی کے سپرد کی تھیں، مدینہ اس زمانہ میں مدینۃ العلم بنا ہوا تھا صحابہ کرامؓ کی علمی مجلسیں جا بجا قائم تھیں نیک بخت خاتون نے یہ تمام اشرفیاں بیٹے کی تعلیم و تربیت پر نثار کر دیں، فروخ جب تک لوٹے بیٹا امام وقت بن چکا تھا، اور امام مالکؒ اور خواجہ حسن بصریؒ جیسے آئمہ اُن کے تلمذ کا فخر حاصل کرنے میں مشغول تھے۔

فروخ جب لوٹ کر آئے تو سیدھے گھر پہنچے، دروازہ کھٹکھٹایا، (باقی آیندہ صفحہ ۹۳ پر)

شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا محمد انور شاہ کشمیری، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عزیز الرحمٰن مفتی دار العلوم، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہم اللہ، اور مولانا سید حسین احمد مدنی مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا محمد طیب مہتمم دار العلوم وغیرہم علمائے کرام اس کی روشن اور تابناک مثالیں ہیں!

(بقیہ گذشتہ صفحہ ۹۲ کا) ربیعہ باہر آئے، نہ باپ نے بیٹے کو پہچانا اور نہ بیٹے نے باپ کو، فروخ نے بے تکلف گھر میں داخل ہونا چاہا تو ربیعہؒ نے سختی سے ڈانٹا کہ "او دشمن خدا! غیر کے گھر میں کیوں گھسا جاتا ہے"؟ فروخ کو یہ سنکر طیش آگیا، "بولے خدا کے دشمن! تو کون ہے جو مجھکو اپنے گھر میں جانے سے روکتا ہے"! غرض بات بڑھی محلہ کے لوگ جمع ہو گئے، امام مالکؒ بھی استاد کا معاملہ سمجھ کر تشریف لائے اور نرمی سے فروخ کو سمجھانا چاہا، انھوں نے کہا "میرا نام فروخ ہے، یہ میرا مکان ہے" ربیعہؒ کی والدہ نے نام سن کر پہچانا اور پکار کر کہا "یہ تو ربیعہ کے باپ ہیں، اب باپ بیٹے گلے ملے اور گھر میں آئے جب اطمینان سے بیٹھے تو ۳۰ ہزار اشرفیاں یاد آئیں، بیوی سے پوچھا کہ "اشرفیاں جو میں نے تمھیں دی تھیں وہ ہیں"؟ بیوی نے جواب دیا کہ "حفاظت سے رکھی ہوئی ہیں"!

فروخؒ جب مسجد نبوی میں نماز پڑھنے گئے تو دیکھا کہ ربیعہ مسند درس پر بیٹھے ہوئے ہیں، چاروں طرف شاگردوں کا ہجوم ہے، فروخ نے یہ عالم دیکھا تو فرط مسرت سے بے خود ہو گئے، خوش خوش گھر آکر بیوی سے کیفیت بیان کی بیوی نے کہا "آپ کو کیا زیادہ پسند ہے، بیٹے کی یہ شان و شوکت یا ۳۰ ہزار اشرفیاں"؟ فروخؒ نے جواب دیا "واللہ! اس جلالتِ شان کے مقابلہ میں ۳۰ ہزار اشرفیوں کی کیا قیمت ہے"! بیوی نے کہا کہ "میں نے وہ اشرفیاں ربیعہ کی تعلیم و تربیت میں صرف کر دی ہیں، کہیئے برا تو نہیں کیا"؟ فروخؒ بے ساختہ بول اٹھے "خدا کی قسم تم نے میرا مال ضائع نہیں کیا"۔ (علماءِ سلف صفحہ ۵۸-۶۰) "م"

اخلاق وعادات اور معاشرت ولباس

اسلامی علوم کے پڑھنے پڑھانے کا مقصد تہذیب اخلاق، تدبیر منزل اور سیاستِ مُدن کے ہر شعبہ میں اسلامی نقطۂ نظر سے ایسی فضا پیدا کرنا ہے جس کو صالح نظام سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، اس مقصد کو دارالعلوم میں ہمیشہ خصوصیت کے ساتھ ملحوظ رکھا گیا ہے، اس لئے دارالعلوم محض ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں ہے جس میں صرف قوتِ ادراک کو تیز کردینے پر اکتفاء کیا جاتا ہو بلکہ وہ اسلامی تہذیب واخلاق، ذہن وفکر، تہذیب نفس اور تعمیر سیرت کی ایسی تربیت گاہ بھی ہے جس میں رہ کر طالب علم اسلامی تہذیب ومعاشرت سے قریب تر اور اس کا خوگر ہو جاتا ہے، اور صرف دارالعلوم سے علمی استفادہ ہی نہیں کرتا بلکہ اساتذہ کے پاکیزہ اخلاق اور ان کی روحانیت سے بھی اثر پذیر ہوتا ہے، نیز زندگی کی جدوجہد میں ایثار وقربانی، تحمل وجفاکشی، خوداعتمادی، امانت ودیانت کی عادت، مخلوق الٰہی کی خدمت اور بڑے سے بڑے مصائب کو برداشت کرنے کا عادی بن جاتا ہے، تاکہ اپنی مخصوص صلاحیتوں سے اُس مقصد کو پورا کرسکے جو علماء کے لئے نہائت ضروری ہے، فضلائے دارالعلوم کی یہ وہ خصوصیت ہے جس کو دیکھنے والا اولین لمحات میں محسوس کرسکتا ہے!

علمائے اسلام کی ہمیشہ سے یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ علم کو دین کے لئے حاصل کرتے تھے، چنانچہ اسلامی تاریخ کا یہ زریں واقعہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ جب بغداد میں مدرسہ نظامیہ قائم ہوا اور اس کے اساتذہ اور طلباء کے لئے گراں قدر مشاہرے اور وظائف مقرر ہوئے اور حکومت کی جانب سے ہر قسم کا سامانِ آسائش مہیا کیا گیا

تو علماءِ بخارا نے "زوالِ علم" کی مجلسِ ماتم منعقد کی، اور اس پر اظہارِ افسوس کیا کہ اب علم، علم کے لئے نہیں بلکہ جاہ و ثروت کے لئے حاصل کیا جائے گا۔!

دارالعلوم کے علماء و طلباء کے پیشِ نظر بھی حصولِ علم کا اصل مقصد دین اور علم ہی رہا ہے، چنانچہ جس زمانہ میں دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا ہندوستان میں برطانوی نظامِ حکومت قائم ہو چکا تھا، اور ملک میں عربی و فارسی کے بجائے انگریزی تعلیم نے لی تھی، جس کے سبب سے معاش کی وہ تمام راہیں جو اب تک ان علوم کے ذریعہ سے کھلتی رہی تھیں یکسر بند ہو چکی تھیں۔

حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ اکثر اپنے درس میں فرمایا کرتے تھے کہ

"جو لوگ علم حاصل کرتے ہیں ان کا مقصد تحصیلِ علم سے یا تو دین ہوتا ہے یا فقط دنیا ان کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو علم کو محض علم کے لئے حاصل کرتے ہیں، یہ بھی غنیمت ہے لیکن علم سے معاش کا کام لینا اور اسی مقصد کے لئے اُسے حاصل کرنا ایک بدترین معصیت ہے! ان لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے" جو بازار سے ایک قیمتی شال اس لئے خرید کرتا ہے کہ اس سے وہ اپنے جوتے صاف کیا کرے گا۔"

اس کے بعد طلباء سے تاکیداً فرماتے کہ "تم لوگوں کو سب سے پہلے اپنی نیت اور ارادہ کا جائزہ لینا چاہیے اور یہ معلوم کرنا چاہیے کہ تم میں سے کون شخص کس طبقہ میں شامل ہونا چاہتا ہے"۔

علماءِ دارالعلوم نے اپنی خدمات کا مناسب معاوضہ لینے میں ہمیشہ للّٰہیت اور عالی ہمتی سے کام لیا ہے، انھوں نے دارالعلوم پر کم سے کم مشاہرہ کا بار ڈالا، اور اپنی اعلیٰ ترین قابلیتوں کے باوجود جن کی بناء پر وہ کسی دوسری درس گاہ میں بیش قرار

تنخواہیں پا سکتے تھے، دین کی خدمت کو ترجیح دی، سادہ اور غریبانہ زندگی بسر کی، چنانچہ حضرت مولانا رفیع الدینؒ جو دار العلوم کے دوسرے مہتمم تھے صرف ۲۰ روپے ماہانہ تنخواہ لیتے تھے، حضرت شیخ الہندؒ نے مجلس شوریٰ کے اصرار کے باوجود ۵۰ روپے سے زیادہ مشاہرہ لینا پسند نہیں فرمایا، حضرت شاہ صاحبؒ نے متاہلانہ زندگی سے پہلے تنخواہ ہی لینا گوارہ نہیں کیا، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے بھی کبھی تنخواہ نہیں لی۔ لیکن جب کبھی اس کے خلاف صورت پیش آئی اور یہاں کے کسی مدرس نے دار العلوم کے رشتہ کو منقطع کر کے کسی دوسری جگہ تعلق پیدا کیا تو اسی شخص کو جسے دار العلوم میں ۷۰ یا ۸۰ روپے ملتے تھے چار چار اور پانچ پانچ سو کی جگہ مل گئی، دار العلوم کے پانچویں مہتمم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کو جب نظامِ دکن نے ریاست حیدر آباد کے منصب افتاء کے لئے چند سال کے واسطے طلب فرمایا تو اس گہرے تعلق کی بناء پر جو فرماں روائے دکن کو دار العلوم سے رہا ہے، مجلس شوریٰ دار العلوم نے مناسب نہیں سمجھا کہ انکار کر دیا جائے، خود مفاد دار العلوم کا تقاضا بھی یہی تھا جس کے بعد میں خاطر خواہ نتائج بھی برآمد ہوئے، چنانچہ حضرت ممدوح نے اس منصب کو قبول فرمالیا، اس منصب کا مقررہ مشاہرہ ایک ہزار روپے تھا۔

بڑھتی قیمت اس شخص کی جس کو دار العلوم میں صرف ۸۵ روپے ماہانہ ملتے تھے

اسی کے ساتھ اگر اس فرق کو بھی ملحوظ رکھا جائے جو تعلیمی حیثیت سے کالجوں، یونیورسٹیوں اور دار العلوم کے درمیان میں پایا جاتا ہے تو یہ چیز اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے، کالجوں میں زیادہ سے زیادہ ایک پروفیسر کو ۳ گھنٹے پڑھانا پڑتا ہے، جبکہ دار العلوم میں مسلسل چھ گھنٹے ہوتے ہیں اور بعض بعض اساتذہ تو خارج اوقات میں بھی کئی کئی سبق پڑھاتے ہیں، یہاں بعض ایسے اساتذہ بھی ملیں گے جن کا دن رات کا مشغلہ درس

تدریس ہی نظر آئے گا۔

دارالعلوم کے ماحول میں لوگ اپنے کاموں کو بالعموم خود اپنے ہاتھوں سے انجام دینے کے عادی ہیں، کپڑے تک دھولینا ان کے نزدیک عار نہیں ہے، مسجد دارالعلوم کی بنیاد کی تعمیر میں علماء و طلباء نے جس جوش و خروش کا اظہار کیا وہ آپ گذشتہ صفحات میں ملاحظہ فرما چکے ہیں، ایسا ہی واقعہ دارالحدیث کی بنیاد کے وقت پیش آیا، اس موقع پر بھی طلباء اور اساتذہ نے جس مخلصانہ ہمت و محبت اور جوش عمل کا مظاہرہ کیا وہ علماء کی زندگی کا ایک ایسا واقعہ ہے جسے بھلایا نہیں جا سکتا، دارالعلوم کی روداد میں مذکور ہے کہ

"جلسہ دارالحدیث کے دن سنگ بنیاد تو رکھ دیا گیا تھا مگر بنیاد تعمیر کرنے کے لئے پہلے کنکریٹ کٹوانا ضروری تھا، اس کے علاوہ کسی قدر بنیاد بھی کھُدنی باقی رہ گئی تھی، ابھی کنکریٹ ڈال کر کوٹنا ہی شروع کیا تھا کہ زور شور کی بارش ہوگئی، اور قریبی تالاب پانی سے بھر گیا، حتیٰ کہ دارالحدیث کی بنیادیں تک پانی سے لبریز ہوگئیں، یہ قطعۂ زمین تالاب ہی کا ایک حصہ تھا، جو تھوڑی مدت پہلے ہی اٹوایا گیا تھا، مٹی چونکہ ابھی پختہ نہ ہوئی تھی اس لئے گر گئی اور بنیاد کا حال دل دل کا سا ہو گیا، درس گاہوں تک پانی کے پہنچ جانے سے عمارتوں کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا تھا،

ادھر تو یہ حالت تھی اُدھر مزدور بالکل نہیں ملتے تھے، بارش کے تواتر سے یہ احتمال بھی نہ تھا کہ پانی دو چار روز میں خشک ہو جائے گا، ڈال لگوا کر پانی نکلوانا شروع کیا گیا مگر سارے دن میں بمشکل بہت تھوڑا سا پانی نکل سکا، بالآخر نماز عصر کے بعد اساتذہ وطلباء نے کمر ہمت باندھی، بالٹیاں لے کر کھڑے ہوگئے اور ایک گھنٹہ میں تمام پانی نکال کر تالاب میں ڈال دیا، پانی نکل جانے پر معلوم ہوا کہ ابھی ایک سخت مرحلہ اور

باقی ہے، بنیادیں نصف قد آدم دلدل ہوگئی تھی، اس موقع پر اساتذہ وطلبار کی محنت وجانفشانی کا منظر قابل دید تھا، کئی سو طلبار لگے ہوئے تھے اور قطاریں بنا کر آناً فاناً میں گارے کی بالٹیاں بھر بھر کر تالاب میں پہنچا رہے تھے، رجز یہ اشعار پڑھتے جاتے تھے اور ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی سعی میں لگا ہوا تھا، اس مقابلہ و مسابقت میں اور بھی لطف تھا، طلبار نے دو جماعتیں بنا کر کام کو نصف نصف تقسیم کرلیا تھا، اس طرح جو کام مزدوروں سے مہینہ بھر میں ہونا مشکل تھا وہ طلبار نے دو دن میں پورا کردیا، کنکریٹ کی کٹائی میں بھی طلبار نے حصہ لیا، یہ کام تنہا معماروں اور مزدوروں سے شاید ایک ماہ میں ختم ہوتا، لیکن طلبار نے اس جد وجہد سے کنکریٹ، اینٹ اور چونا موقع پر پہنچایا کہ ایک ہفتہ میں بنیادیں اوپر آگئیں، (روداد ۱۳۳۰ھ)

غرض کہ علم و عمل کی سادگی، بے تکلفی اور جفاکشی اس جماعت کا طغرائے امتیاز ہے، اسی سادگی، بے تکلفی اور کفائت شعاری کا اثر ہے کہ دار العلوم کے علمار و طلبار کا بجز معمولی کرتہ پاجامہ، دو پلی ٹوپی اور سلیم شاہی جوتہ کے کوئی مخصوص اور امتیازی لباس نہیں ہے یہی حال کھانے کی سادگی کا ہے، آرائشی فرنیچر کی انھیں چنداں ضرورت پیش نہیں آتی، صرف چارپائی اور بوریہ یا ٹاٹ کا معمولی فرش ان کے بیٹھنے اور سونے کے لئے کافی ہے۔

جدید تہذیب و تمدن کی طرح جس میں زندگی کے لئے گوناگوں بے شمار تکلفات پیدا کر لئے گئے ہیں وہ اپنے آپ کو گم کردینے کے عموماً عادی نہیں ہوتے۔ جس کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ جہاد زندگی کی بڑی سے بڑی تکلیف برداشت کر لینے کے خوگر ہو جاتے ہیں یہ وہ خصوصیت ہے جسے ان لوگوں سے ملنے والا اولین لمحات میں محسوس کرلیتا ہے،

یہ نہ کہنے کی بات ہے اور نہ سننے سے متعلق ہے، بلکہ دارالعلوم کی اس خصوصیت کو صرف اسکی زندگی کے آئینہ ہی میں دیکھا جا سکتا ہے!

فضلائے دارالعلوم کے وظائف زندگی

اب تک دارالعلوم کی آغوش علم و تربیت سے ۴ ہزار سے زیادہ علماء، فضلاء پیدا ہو چکے ہیں، جو اسلام کا کلمہ بلند کرنے کے لئے دنیائے اسلام کے بیشتر ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں، بحر شمالی یعنی روس کی سرحد سے لیکر افغانستان، آذربائجان، ایران، مکران اور مغرب اقصیٰ تک، اور مشرقی ترکستان یعنی سرحد چین سے لیکر کشمیر و چترال کی وادیوں، آسام کی پہاڑیوں اور برما، ملایا، جاوا، سماٹرا، یورپ تک، جنوبی افریقہ اور یوگنڈا تک پہنچکر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت انجام دے چکے ہیں، حتیٰ کہ دنیائے اسلام کے مرکز مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں مدرسۃ الشرعیہ وغیرہ اسلامی علوم کی درسگاہیں قائم کرکے اسلامی تعلیمات کی قندیل روشن کئے ہوئے ہیں؛ ان میں صاحب درس و افتا بھی ہیں اور مصنف و مبلغ بھی۔ امراض روحانی کے معالج بھی ہیں اور امراض جسمانی کے طبیب بھی، واعظ بھی ہیں اور ادیب بھی، لیڈر بھی ہیں اور اخبار نویس بھی ہیں، قاضی و جج بھی ہیں اور مجالس مقننہ کے رکن بھی، مفکر بھی ہیں اور فلسفی بھی غرض کہ مسلمانوں کی علمی، اخلاقی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کا کوئی گوشہ نہیں جس میں دارالعلوم کے فیض یافتہ موجود نہ ہوں،

ایک مرتبہ لاہور کے مشہور روزنامہ "سیاست" نے لکھا تھا کہ

"جہاں تک تحفظ دین، تردید مخالفین اور اصلاح مسلمین کا تعلق ہے، دارالعلوم

دیوبند کے مدرسین و مبلغین کا حصہ سارے ہندوستان سے بڑھ چڑھ کر ہے، مثال کے طور پر ان غیر محدود کوششوں کو ملاحظہ کر لیا جائے جو آریہ سماج نے اسلام کے خلاف کیں، تو آپ کو روز روشن کی طرح نظر آئے گا کہ ان مساعی کے مقابلہ میں سب سے نمایاں طریق پر جو سینہ سپر ہوا وہ مدرسہ عالیہ دیوبند ہی ہے، اور دعویٰ سے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں دینِ حنیف، علوم عربیہ، تفسیر، حدیث اور فقہ کے چرچے بعونہ تعالیٰ بہت حد تک دیوبند کے وجود مسعود کی وجہ سے قائم ہیں۔" (ریاست لاہور، مؤرخہ ۲ جون ۱۹۲۳ء)

کلکتہ کے اخبار "عصر جدید" نے علمائے دار العلوم کی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ۔

"دار العلوم دیوبند اسلام کی جو مذہبی اور تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے، اور مغربی تہذیب و تمدن کے سیلاب سے جس طرح اس نے اسلامی ہند کی روحانی عمارت کو محفوظ رکھا ہے، ہندوستان کے طویل و عریض براعظم کا ایک ایک گوشہ اس کی گواہی دے سکتا ہے، ایسے وقت میں جبکہ علوم جدیدہ کی روشنی نے ظاہر بین نظروں کو خیرہ کر دیا تھا، جبکہ دنیاوی عزت اور مناصب کی کشش اچھے اچھے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی، جبکہ لوگ مذہب سے بے پروا، اور مذہبی تعلیم کی طرف سے غافل ہو چکے تھے، اور قال اللہ و قال الرسول کی مقدس آواز نئی تعلیم کے نقار خانہ میں دب گئی تھی، اور مغربی تعلیم و تمدن کے شور و غوغا سے مغلوب ہو چکی تھی، اس نازک وقت میں دیوبند اور صرف دیوبند تھا۔ جو قرآن و حدیث کے علَم کو سنبھالے ہوئے کھڑا رہا، ملک کی غفلتوں اور

سرد مہریوں کی آندھی نے رہ رہ کر اس کو گرانا چاہا مگر وہ پہاڑ کی طرح قائم رہا، فاتح تہذیب کی خندہ زنی اس کو اپنی قدامت سے منحرف نہ کر سکی، نئی تعلیم کے سیلاب نے چاہا کہ اپنی رو میں اسے بہالے جائے مگر کس مپرسی کے باوجود وہ ایک طرف اپنے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہا اور دوسری طرف اپنی روحانیت کی روشنی ملک کے ہر ہر گوشہ میں پہنچاتا رہا، یہاں تک کہ مسلسل جد وجہد کے بعد آج نہ صرف پشاور اور رنگون بلکہ قفقاز، موصل، بخارا اور اسلامی دنیا کے ہر حصہ سے فدائیان قرآن وحدیث آ آ کر پروانہ وار اس کے گرد مجتمع ہیں"۔

(عصر جدید، مورخہ ۱۳، اکتوبر ۱۹۳۶ء)

اب سے تقریباً ۳۰ سال پہلے ہندوستان کے ایک بڑے تاجر نے لکھا تھا کہ

"میں دیکھتا ہوں کہ ہندوستان کے اکثر حصوں میں جہاں کہیں کسی درس گاہ، انجمن یا مدرسہ و مکتب میں کسی ذی استعداد عالم کی ضرورت ہوتی ہے تو دار العلوم دیوبند ہی سے بلایا جاتا ہے اور وہیں کے تعلیم یافتہ عالم ور مدرس یہ قابلیت رکھتے ہیں کہ ہر قسم کی کتابیں بخوبی پڑھا سکیں، کلکتہ، بمبئی، دہلی، کانپور، الہ آباد، بنارس، بریلی آگرہ، میرٹھ، جس جگہ بھی آپ دیکھیں گے آپ کو دار العلوم ہی کے فیض یافتہ مسند درس پر بیٹھے ہوئے ملیں گے"۔ (دار العلوم دیوبند کی سیر اور اس کی مختصر تاریخ مطبوعہ ۱۳۴۵ھ)

دار العلوم کے ہزاروں فرزندوں میں سے چند کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ دیوبندی، حضرت مولانا احمد حسنؒ محدث امروہی، حضرت مولانا عبد العلیؒ محدث دہلوی، حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا صدیق احمد مفتی ریاست مالیر کوٹلہ و استاد مسیح الملک حکیم اجمل خان

دہلوی، مولانا منصور علی خاں مراد آبادی، مولانا نواب محی الدین خاں قاضی ریاست بھوپال
مولانا عبد الرزاق قاضی القضاۃ دولت افغانستان، مولانا عبد الحق پور قاضوی، حضرت
مولانا حافظ محمد احمد مہتمم دار العلوم دیوبند، حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی مہتمم
دیوبند، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن مفتی دار العلوم دیوبند، مولانا حکیم اجمیل الدین
نگینوی، استاد مسیح الملک مرحوم، مولانا سید مرتضیٰ حسن چاند پوری، مولانا سیف الرحمن
کابلی، مولانا عبد الحق مفسر تفسیر حقانی، مولانا عبد اللہ انبہٹوی ناظم دینیات مسلم
یونیورسٹی علی گڈھ، مولانا ماجد علی پرنسپل دینیات مدرسہ عالیہ کلکتہ، مولانا محمد ابراہیم
آروی، مولانا حافظ عبد الرحمن محدث امروہی، مولانا شاہ وارث حسن لکھنوی، مولانا
محمد یحییٰ سہسرامی پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ، مولانا محمد یحییٰ کاندہلوی محدث مدرسہ مظاہر
علوم سہارنپور، مولانا خلیل احمد مصنف بذل المجہود شرح ابوداؤد، مولانا غلام رسول ہزاروی
حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا محمد میاں
منصور انصاری سفیر منتخب حکومت افغانستان، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت
مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا سید احمد بانی مدرسۃ الشرعیہ مدینہ منورہ، مولانا
سعید احمد محدث چاٹگام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ثناء اللہ امرتسری،
مولانا عبد الرحمن کامل پوری صدر مدرس مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، مولانا فضل ربی
رکن ہیئۃ تمیزیہ حکومت افغانستان، مولانا عبد العزیز خطیب جامع مسجد گوجرانوالہ،
مولانا نجم الدین پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور، حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین دیوبندی
حضرت مولانا رسول خاں ہزاروی، حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہی مدرس دار العلوم
مولانا سید فخر الدین صدر مدرس مدرسہ شاہی مراد آباد، حضرت مولانا محمد ابراہیم

بلیاوی مدرس دار العلوم، حضرت مولانا عبد السمیع دیوبندی، مولانا سراج احمد میرٹھی، مولانا مفتی محمد سہول پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ، حضرت مولانا محمد طیب مہتمم دار العلوم دیوبند، مولانا احمد علی مفسر لاہور، مولانا مناظر احسن گیلانی سابق صدر دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، مولانا حفظ الرحمٰن ناظم جمیعۃ علماء ہند، مولانا شائق احمد ایڈیٹر اخبار "انصاف" و "عصر جدید" کلکتہ، مولانا مظہر الدین ایڈیٹر الامان دہلی، مولانا حبیب الرحمٰن بجنوری ایڈیٹر اخبار "نجات" بجنور، مولانا احسان اللہ خاں ایڈیٹر "ادبی دنیا" لاہور، مولانا شمس الحق افغانی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ناظم اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدیر "برہان" دہلی و پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ، مولانا محمد میاں دیوبندی ناظم جمیعۃ علماء ہند مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی مولانا معظم علی نگینوی، مولانا محمد منظور نعمانی ایڈیٹر "الفرقان" لکھنؤ، مولانا حامد الانصاری غازی سابق ایڈیٹر "مدینہ بجنور"، مولانا زین العابدین سجاد قاضی شہر میرٹھ مولانا ابو الحسن علی ندوی، مولانا احتشام الحق تھانوی وغیرہم جیسے علماء جو آسمان علم کے آفتاب و ماہتاب ہیں اسی درس گاہ کے فیض یاب اور اسی مے خانے کے جرعہ نوش ہیں!

یہ وہ حضرات ہیں جو اپنے علم و فضل، درس و تدریس، رشد و ہدایت، دعوت تبلیغ سیاسی قیادت، تصنیفی اور صحافتی کمالات کے باعث دنیائے اسلام سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں، ان مشاہیر کے کارناموں سے ان کے مقامی خطے اور ملک کے دینی و غیر دینی حلقے ہی واقف نہیں بلکہ ہندوستان و پاکستان کا کونہ کونہ اور چپہ چپہ ان کے فیوض علمیہ سے سیراب ہو رہا ہے!

نصابِ تعلیم

تیرہویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) میں ہندوستان میں علم کے تین مرکزِ فکر تھے، دہلی، لکھنؤ، اور خیرآباد۔ گو نصاب تعلیم تینوں کا قدر مشترک تھا، تاہم تینوں کے نقطہائے نظر مختلف تھے، دہلی میں علم حدیث و تفسیر پر زیادہ توجہ کی جاتی تھی، حضرت شاہ ولی اللہ کا خاندان کتاب و سنت کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تدریس میں ہمہ تن مشغول تھا۔ علوم معقولہ کی حیثیت ثانوی درجہ کی تھی لکھنؤ میں علمائے فرنگی محل پر ماوراءالنہر کا ساتویں صدی ہجری والا قدیم رنگ چھایا ہوا تھا، فقہ اور اصول فقہ کو ان کے ہاں سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی، خیرآبادی مرکز کا علمی موضوع صرف منطق و فلسفہ تھا، اور یہ علوم اس قدر اہتمام سے پڑھائے جاتے تھے کہ جملہ علوم کی تعلیم ان کے سامنے ماند پڑ گئی تھی،

دارالعلوم کے نصاب تعلیم میں ان تینوں مقامات کی خصوصیات کو جمع کر دیا گیا ہے، ان تینوں کے امتزاج سے جو نصاب تیار ہوا ہے تین چوتھائی صدی سے وہی بالعموم مدارس عربیہ میں زیر درس ہے، اس نصاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ طالب علم میں قوت مطالعہ اور امعانِ نظر پیدا کرنے کا اس میں بہت لحاظ رکھا گیا ہے،

یہ نصاب تعلیم حسب تفصیل ذیل بائیس ۲۲ علوم صرف[۱]، نحو[۲]، معانی[۳]، عروض[۴]، ادب[۵]، تاریخ[۶]، منطق[۷]، فلسفہ[۸]، ہندسہ[۹]، ہیئت[۱۰]، تجوید و قرأت[۱۱]، طب[۱۲]، مناظرہ[۱۳]، عقائد[۱۴]، کلام[۱۵]، اصول فقہ[۱۶]، فقہ[۱۷]، فرائض[۱۸]، اصول حدیث[۱۹]، حدیث[۲۰]، اصول تفسیر[۲۱]، تفسیر[۲۲] اور ان کی ۱۰۶ کتابوں پر مشتمل ہے۔

سال اول

میزان[1] الصرف تمام، منشعب[2] تمام، پنج[3] گنج تا اختتام خاصیت ابواب صرف[4] میر تمام، علم[5] الصیغہ تا ابتدائے افادات، نحو[6] میر تمام، شرح[7] مائۃ عامل تمام، ہدایۃ[8] النحو تمام، مفید[9] الطالبین مع ترکیب تمام، کبریٰ[10] تمام، ایساغوجی[11] تمام مرقات[12] تمام۔

سال ثانی

فصول[13] اکبری تا ختم بحث مخارج، نفحۃ[14] الیمن ۲ باب، نفحۃ[15] العرب تمام، رسالہ[16] میرۃ مولانا عماد الدین (عربی)، تمام، کافیہ[17] تمام، شرح[18] جامی بحث فعل تمام، ابن[19] عقیل تا مرفوعات، نور[20] الایضاح تمام، قدوری[21] تمام، شرح[22] تہذیب تا ضابطہ، قطبی[23] تصدیقات تا ابتدائے بحث مختلفات، قطبی[24] تصورات مع میر تمام۔

سال ثالث

مقامات[25] حریری ۲۵ مقامہ، دروس[26] التاریخ الاسلامی اول و ثانی تمام شرح[27] جامی بحث اسم تمام، تلخیص[28] المفتاح تمام، عروض[29] المفتاح تمام، سلم[30] العلوم تمام، ملا حسن[31] تا ابتدائے بحث جنس، کنز[32] الدقائق تمام، اصول[33] الشاشی تمام،

سال رابع

مختصر[34] المعانی تمام، دروس[35] التاریخ الاسلامی ثالث و رابع تمام، ہیبذی[36] تمام رشیدیہ[37] تمام، شرح[38] عقائد النسفی مع خیالی تا ابتدائے احوال قبر، میر[39] زاہد رسالہ تمام، میر زاہد[40] ملا جلال تا بحث موضوع، نور[41] الانوار تا ابتدائے قیاس، شرح[42] وقایہ تمام

سال خامس

مشکوٰۃ[43] شریف تمام، مع نخبۃ[44] الفکر تمام، تاریخ[45] ابی الفداء، صرف مطالعہ، ثلث اول، جلالین[46] شریف تمام، مع فوز[47] الکبیر تمام، شرح[48] عقائد النسفی بلا خیالی تمام، ہدایہ[49] اولین تمام، حسامی[50] تمام، مسامرہ[51] تمام۔

سال سادس

دیوان[52] متنبی تا ردیف عین، دیوان[53] حماسہ تین باب، تاریخ[54] ابی الفداء

دصرف مطالعہ، ثلث ثانی، سبعہ معلقہ[۵۵] تمام، توضیح تلویح[۵۶] تا ابتدائے بحث حقیقۃ و مجاز، مسلم الثبوت[۵۷] تا ختم باب ثانی، ہدایہ[۵۸] اخیرین تمام، سراجی[۵۹] تمام، تصریح[۶۰] تمام، شرح چغمینی[۶۱] تا ابتدائے بحث قسی، بست باب[۶۲] تمام، اقلیدس[۶۳] مقالۂ اولیٰ۔

سال سابع[۷]

مطول[۶۴] تا ما انا قلت، امور عامہ[۶۵] تا بحث وجود ذہنی، تاریخ ابی الفداء[۶۶]، دصرف مطالعہ، ثلث ثالث، حمد اللہ[۶۷] تا اختتام قیاس، قاضی مبارک[۶۸] تا مفہوم موجز[۶۹] تمام، قانونچہ[۷۰] تمام، شرح اسباب[۷۱] جلد اول تا ختم امراض صدر، نفیسی[۷۲] تا ختم بحث نبض حمیات قانون[۷۳] تا ختم فن اول، شرح اسباب[۷۴] جلد ثانی تا ختم امراض خاصہ،

یہ کتب بلحاظ استعداد طلبہ کئی سنین میں منقسم بھی ہو سکتی ہیں، صدرا[۷۵] دو فصل، شمس بازغہ[۷۶] تا ابتدائے بحث حرکت، شرح عقائد[۷۷] جلالی تا ختم صفات، بیضاوی[۷۸] سورۂ بقرہ تمام

سال ثامن[۸]

بخاری[۷۹] شریف تمام، ترمذی[۸۰] شریف تمام، مسلم[۸۱] شریف تمام، ابوداؤد[۸۲] شریف تمام، نسائی[۸۳] شریف تمام، شمائل[۸۴] ترمذی شریف تمام، طحاوی[۸۵] شریف تمام، ابن[۸۶] ماجہ شریف تمام، موطا[۸۷] امام محمدؒ تمام، موطا[۸۸] امام مالکؒ تمام،

سال تاسع[۹]

ابن[۸۹] کثیر ثلث اول تمام، ابن[۹۰] کثیر ثلث ثانی تمام، ابن[۹۱] کثیر ثلث ثالث تمام بیضاوی[۹۲] شریف وآل عمران ثلث اول تمام، بیضاوی[۹۳] شریف ثلث ثانی بیضاوی[۹۴] شریف ثلث ثالث تمام۔

اسی نصاب کے ساتھ ۱۲ کتب تجوید و مشق قرآن کریم بھی شامل ہیں۔

دار العلوم کے نظام تعلیم کی ایک اہم خصوصیت

عموماً مدارس عربیہ اور بالخصوص دار العلوم کے نظام تعلیم میں ایک خصوصیت بڑی اہمیت رکھتی ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے یونیورسٹی نظام میں ابھی

تک اس کی افادیت پر توجہ نہیں کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ "جماعت وار نظام تعلیم" جو عام طور پر علمی درس گاہوں اور یونیورسٹیوں میں رائج ہے، اس کے بجائے دارالعلوم میں "کتاب وار نظام تعلیم" اختیار کیا گیا ہے یعنی ان مدارس میں "جماعت بندی" (کلاس سسٹم) نہیں ہے، بلکہ طلباء کو تعلیمی لحاظ سے کتابوں پر تقسیم کیا جاتا ہے، اگر یہ بتلانا ہو کہ طالب علم تعلیمی استعداد کے لحاظ سے کس دور سے گذر رہا ہے تو جماعت کا نام لینے کے بجائے یہ کہا جائیگا کہ وہ فلاں فلاں کتاب پڑھ چکا ہے یا پڑھ رہا ہے، سالانہ تعلیمی ترقی میں بھی درجات کے بجائے کتابوں ہی کا لحاظ رکھا جاتا ہے، سالانہ امتحان میں اگر طالب علم ایک یا دو کتابوں میں فیل ہوجاتا ہے اور بقیہ میں پاس تو وہ کتابیں جن میں طالب علم فیل ہوا ہے ان کتابوں کی سالانہ ترقی میں حارج نہیں ہوتیں جن میں اس نے کامیابی حاصل کرلی ہو جن کتابوں میں طالب علم ناکام ہوتا ہے سال آئندہ میں صرف ان ہی کتابوں کا اُسے اعادہ کرنا پڑتا ہے، یہ نہیں ہوتا کہ ایک یا دو کتاب کی ناکامی کے باعث کامیاب شدہ کتابوں کے اعادہ پر بھی مجبور کیا جائے جیسا کہ یونیورسٹی نظام میں بالعموم ہوتا ہے، اس نظام تعلیم کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں بہت ہی کم طلباء ایسے نکلتے ہیں جو ساری کتابوں میں ناکام ہوں، اس لئے طالب علم کی نفسیات پر اس کا یہ اثر مرتب ہوتا ہے کہ اسے اپنی جزئی ناکامی کا اس شدت سے احساس نہیں ہونے پاتا جس شدت سے جماعت وار نظام کی کلی ناکامی میں ہوتا ہے، اس کا نتیجہ جہاں ایک طرف یہ نکلتا ہے کہ طالب میں بددلی پیدا ہونے نہیں پاتی، وہیں دوسری جانب اس کی مدت تعلیم اور مصارف میں بھی فی الجملہ وقت اور روپیہ کی کفایت ہوجاتی ہے۔

اس کے برخلاف "جماعت وار نظام تعلیم" میں اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ امتحان میں فیل ہوجانے کی وجہ سے بعض طلباء میں ایسی بے رغبتی اور بددلی پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ تعلیم

ہی کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہدیتے ہیں، بلکہ بعض اوقات تو امتحان کی ناکامی محنتی اور غیور طلباء میں خطرناک نتائج تک پیدا کردینے کا باعث بن جاتی ہے اور طالب علم اپنے آپ کو شرمندگی سے بچانے کے لئے خودکشی تک کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے، کتاب وار نظام تعلیم میں بالعموم ان میں سے کوئی بات پیش نہیں آتی۔

ابتدائی نصاب تعلیم

دارالعلوم کے قواعد کے مطابق "درجات عربیہ" تک پہنچنے کے لئے مندرجہ ذیل ابتدائی نصاب تعلیم کی تکمیل لازمی ہے:

(۱)۔ سب سے پہلے قرآن مجید کا کم از کم ناظرہ پڑھنا ضروری ہے، قرآن مجید سے قبل بالعموم قاعدہ بغدادی کے نام سے جو قاعدہ مشہور ہے وہ پڑھایا جاتا ہے، قرآن مجید کی تحصیل میں کم و بیش دو سال صرف ہوتے ہیں۔ مدت کا یہ تخمینہ ان چھوٹے بچوں کے لئے ہے جو پانچ سال کی عمر میں پڑھنے بٹھا دیئے گئے ہوں اور متوسط درجہ کا ذہن رکھتے ہوں، ورنہ ذی شعور بچے اس سے کم مدت میں بھی قرآن مجید ختم کر لیتے ہیں۔

(۲)۔ قرآن مجید کے بعد اردو اور فارسی کی تحصیل بھی ضروری ہے، یہ نصاب مفصلہ ذیل پانچ درجات میں منقسم ہے۔ نقشہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

نصاب درجات فارسی وریاضی اُردو

جماعت	ادب فارسی ، فقہ ، اردو	قواعد و تاریخ
جماعت پنجم (ابتدائی)	قاعدہ تعلیم الاسلام ، کریما ، مفید نامہ ، تعلیم الاسلام حصہ اول و دوم ۔	تاریخ الاسلام حصہ اول آمدنامہ میں حفظ قواعد مصادر اور صرف بلا گردان
جماعت چہارم	گفتگو نامہ ، گلزار دبستاں ، مکتوب احمدی اردو دبخط شکستہ ، اردو کی تیسری کتاب تعلیم الاسلام حصہ سوم	آمد نامہ ، رسالہ نادر صرف صغیر و کبیر رسالہ قواعد اُردو تاریخ الاسلام حصہ دوم نصف اول
جماعت سوم	گلستاں چہار باب بغیر دیباچہ ، انشائے فارغ پند نامہ عطار تا صفحہ ۳۰ تعلیم الاسلام حصہ چہارم	احسن القواعد باب اول تا صفحہ ۲۸ تاریخ الاسلام حصہ دوم نصف دوم
جماعت دوم	بوستاں چہار باب مع دیباچہ ، رقعات عالمگیری تا صفحہ ۳۲ ، مالا بدمنہ تا کتاب الحج ،	احسن القواعد از حروف مرکبہ تا اقسام جملہ از ص ۳۵ تا ص ۱۲ تاریخ الاسلام حصہ سوم
جماعت اول (اعلیٰ)	مثنوی مولانا رومؒ دفتر اول نصف اول ، سکندر نامہ تا جشن نوشابہ ، انوار سہیلی دو باب بغیر دیباچہ ، رقعات امان اللہ حسینی ،	احسن القواعد اقسام جملہ بلحاظ ترکیب از ص ۴۲ تا ص ۲ ، سرور المحزون (تاریخ)

مندرجہ بالا کتب کے علاوہ جغرافیہ شروع سے ایشیا تک اور ریاضی تحریر مہندسے اربعہ ، ستہ مساحت اور مثلث تک پڑھائی جاتی ہے ۔

طریق درس

دارالعلوم میں درس کا طریق عموماً یہ رائج ہے کہ طلباء کی جماعت میں سے روزانہ باری باری ایک ایک طالب علم عبارتِ کتاب کی قراءت کرتا ہے اور استاد جس کی نشست نسبتاً بلند ہوتی ہے، عبارت کے حل اور ترجمہ کے ساتھ مسئلہ کی تشریح کرتا جاتا ہے، طلباء جو اکثر پہلے سے کتاب کا مطالعہ کئے ہوئے ہوتے ہیں اثناء درس میں سوالات کرتے رہتے ہیں، استاد بخندہ پیشانی ان سب کا جواب دیتا جاتا ہے اور جب تک طالب علم مسئلہ کو سمجھ کر مطمئن نہیں ہو جاتا، سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہتا ہے،

بڑی جماعت کے باذوق طلباء، متقدمین کی روش کے مطابق استاد کی تقریر کو قلم بند کرنا ضروری خیال کرتے ہیں، چنانچہ حضرت گنگوہیؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کی درس ترمذی کی تقریر نفح الشذی اور الورد الشذی، اور حضرت مولانا محمد انور شاہؒ کے درس صحیح بخاری کی تقریر العرف الشذی اور فیض الباری جو چار ضخیم جلدوں میں ہے اسی ذوق املاء کا نتیجہ ہیں، اس طرح کی املائی تقریروں میں سے یہ چند مثالیں ہیں جو زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں، ورنہ جو دعوت طباعت کے انتظار میں ہنوز چشم براہ ہیں ان کا شمار بھی مشکل ہے، متاعِ علمی کے یہ جواہر ریزے بکثرت فضلائے دارالعلوم کے پاس موجود ہیں۔

استاد کی تقریر و تعلیم اُردو میں ہوتی ہے جو پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، البتہ جو طلباء اردو نہیں سمجھتے ان کو دوسری زبانوں میں سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے، تاآنکہ وہ اردو سمجھنے کے قابل ہو جائیں۔

علوم و فنون کی تعلیم میں مادری زبان کو جو اہمیت حاصل ہے اس کو یونیورسٹی کے

کے نظام تعلیم میں بڑی مدت کے بعد سمجھا جا سکا ہے، یہ حقیقت ہے کہ علمی مسائل جس آسانی سے مادری زبان میں سمجھ میں آتے ہیں اور حافظہ میں محفوظ رہتے ہیں وہ دوسری زبان میں ممکن نہیں ہے، مگر انگریزی اقتدار کے غلبہ نے قوم کے دماغوں کو اس قدر متأثر اور مغلوب کر دیا تھا کہ وہ ایک عرصہ تک اس حقیقت کا سراغ نہ پا سکی، ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت کو سب سے پہلے جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن اور جامعہ ملیہ دہلی نے محسوس کیا اور اس پر عمل درآمد شروع کر دیا، جس میں دونوں جگہ نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور انھوں نے دوسری یونیورسٹیوں کے لئے ایک قابل تقلید مثال پیش کر دی اور اب تو ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی جانب سے یہ مطالبہ عام ہوتا جا رہا ہے کہ اُن میں ذریعہ تعلیم مادری زبان قرار دی جائے۔

بہرحال اس سلسلہ میں اولیت کا سہرا دارالعلوم ہی کے سر ہے، دارالعلوم میں جس چیز کو سو سال پہلے سمجھ لیا گیا تھا بیسویں صدی کے ماہرین تعلیم بھی بالآخر اسی نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور ہوئے[1]۔

---

[1] یہ تو اس مسئلہ کا تعلیمی پہلو ہے، لیکن اس کے علاوہ اس کا ایک لسانی پہلو بھی ہے، وہ یہ کہ دارالعلوم میں اُردو زبان کے درسی زبان ہونے سے اردو کو جو عظیم الشان فائدہ پہنچا ہے گو اُس پر اردو کے ترقی و اشاعت کے حلقوں کی ابھی تک نظر نہیں گئی ہے تاہم اس کے نتائج و ثمرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا، وہ یہ ہے کہ دارالعلوم چونکہ عالم اسلامی کے مسلمانوں کی مرکزی درس گاہ ہے اور اس میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے علاوہ مختلف ممالک کے طلبا تحصیل علم کی غرض سے آتے ہیں، وہ اپنے دورانِ قیام میں خاصی اردو سیکھ جاتے ہیں۔ چنانچہ چند سال پہلے کی بات (باقی حاشیہ اگلے صفحہ ۱۱۲ پر ملاحظہ ہو)

اوقات تعلیم

جیسا کہ عموماً مدارس عربیہ کا معمول ہے دارالعلوم میں بھی درس کے اوقات دو حصوں پر تقسیم ہیں، پہلا حصہ چار گھنٹہ کا ہے، اور دوسرا دو گھنٹہ کا، موسم گرما میں صبح کو ۶ بجے سے ۱۰ بجے تک اور بعد ظہر ½۳ بجے سے ½۵ تک اور موسم سرما میں صبح کو ½۷ بجے سے ½۱۱ تک، اور بعد ظہر ۲ بجے سے ۴ بجے تک درس کے اوقات ہیں۔

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ ۱۱۱) کا ہے کہ ایک صاحب جنھوں نے مختلف ممالک کی سیاحت کی تھی، دارالعلوم میں آئے تھے وہ کہتے تھے کہ

"میں جب بخارا پہنچا جو وسط ایشیا کا مشہور مقام ہے تو وہاں ایک ایسے شخص سے میری ملاقات ہوئی جس نے مجھے ہندوستانی سمجھ کر ہمدردانہ لہجہ میں اردو میں مجھ سے گفتگو کی، مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ہندوستان سے اس قدر دور اتنی صاف اردو اس کو کیوں کر آئی ہوگی، میرے دریافت کرنے پر اس نے بتلایا کہ "یہ دارالعلوم کا فیض تعلیم ہے اور میں ہی نہیں بلکہ یہاں کا علمی حلقہ بالعموم اردو سمجھتا اور بولتا ہے، اس شخص نے نہایت اخلاق و محبت سے مجھے اپنے یہاں مہمان ٹھہرایا، اور میرے اعزاز میں ایک شاندار پارٹی دی جس کی یہ خصوصیت میں کبھی نہ بھولوں گا کہ اس پارٹی میں جس نے بھی تقریر کی وہ میری خاطر سے اردو میں ہی کی"۔

غرض کہ اس طرح دارالعلوم نے اردو کے دائرے کو اپنے طلباء کے ذریعہ دنیا کے تقریباً تمام ایشیائی ممالک تک وسیع کر دیا ہے! "م"

وقت برابر کے ۶ گھنٹوں پر تقسیم ہے ،

موسم کے تغیر کے ساتھ تدریجاً یہ اوقات بدلتے رہتے ہیں اور پندرہ پندرہ منٹ کے فصل سے گھٹائے بڑھائے جاتے ہیں ، یعنی چھ سے سوا چھ ، اور دو سے سوا دو ، اسی طرح ساڑھے سات سے سوا سات اور ساڑھے تین سے سوا تین ۔

عام طور سے ۲۵ شوال سے اسباق شروع ہو جاتے ہیں اور آخر رجب تک جاری رہتے ہیں ، شعبان میں سالانہ امتحان ہوتا ہے جو تقریباً تین ہفتہ تک جاری رہتا ہے شعبان کے آخری ہفتہ سے عام تعطیل ہو جاتی ہے ، جو شوال کے ہفتہ اول تک رہتی ہے ، دوسرے ہفتہ سے داخلہ شروع ہو جاتا ہے ، جمعہ ، ہفتہ وار تعطیل کا دن ہے

قواعدِ داخلہ

داخلہ شوال کے دوسرے ہفتہ سے شروع ہو کر تیسرے ہفتہ کے آخر تک ہوتا ہے ، لیکن جدید طلباء کا داخلہ اس سے کسی قدر پیشتر بند ہو جاتا ہے ۔

داخلہ کے وقت جدید امیدوار کی علمی استعداد کی جانچ امتحان داخلہ کے ذریعہ کی جاتی ہے اور امیدوار استعداد کے مطابق جس جماعت کے قابل سمجھا جاتا ہے اس میں بشرط گنجائش جگہ حسب صوابدید ناظم تعلیمات داخلہ کیا جاتا ہے ، کسی دوسری درس گاہ کی سند کی بنا پر داخلہ نہیں ہو سکتا ، البتہ جو طلباء درجات فارسی سے ترقی پا کر درجۂ عربی میں داخل ہوتے ہیں وہ داخلہ کے امتحان سے مستثنیٰ ہیں ۔

درجۂ قرآن مجید اور درجۂ فارسی میں داخلہ درخواست کے ذریعہ اور درجۂ عربی میں مطبوعہ فارم کے ذریعہ ہوتا ہے ، فارم داخلہ کی دو قسمیں ہیں ، قدیم اور جدید " قدیم "

سے وہ طلبا، مراد ہیں جنھوں نے سال گذشتہ میں دار العلوم ہی میں پڑھا ہو، اور نووارد طلبا، کو "جدید" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

فارم داخلہ کے ذریعہ طالب علم اس کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ مستعدی اور یکسوئی کے ساتھ تحصیل علم میں مشغول رہے گا، اور دار العلوم کے مروجہ قوانین کی پوری پوری پابندی کرے گا، اور اپنی وضع قطع، نشست و برخواست اور نوشت وخواند وغیرہ امور میں قدیم طالب علمانہ وضع ومعاشرت کا دل سے پابند رہے گا،

باستثناء دورۂ حدیث جس میں دس کتابیں پڑھائی جاتی ہیں کسی طالب علم کو ایک وقت میں چار کتابوں سے زیادہ اسباق پڑھنے کی اجازت نہیں ہے، البتہ کسی کتاب کے ختم ہو جانے پر اُسی گھنٹہ میں دوسری کتاب مل سکتی ہے، چنانچہ ابتدائی کتابوں کی جماعتوں میں اکثر وبیشتر ایسا ہی ہوتا ہے، اور اس طرح ایک سال میں طالب علم آٹھ تک کتابیں پڑھ لیتا ہے،

جب کسی کتاب کی جماعت میں طلبا، کی تعداد غیر معمولی طور پر بڑھ جاتی ہے تو باستثنائے دورۂ حدیث ایسی جماعت کو ایک سے زائد اساتذہ پر تقسیم کر دیا جاتا ہے،

داخلہ کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں ہے، البتہ اُن بیرونی کم سن بچوں کو جو دار الاقامہ میں تنہا رہ سکیں داخل نہیں کیا جاتا، کسی پیشہ کی بناء پر کوئی ایسی پابندی بھی عائد نہیں ہے، جس کے سبب سے قوم کے کچھ افراد پر تعلیم وتعلم کے دروازے بند ہو جائیں، بلکہ ہر وہ شخص جس کو اکتساب علم کا کچھ بھی ذوق ہو وہ بغیر کسی رکاوٹ کے علم حاصل کر سکتا ہے عمر اور پیشہ کی قید سے مدارس عربیہ ہمیشہ آزاد رہے ہیں، اور ان میں رنگ ونسل، امیر

وغریب اور آزاد وغلام کے مابین کوئی امتیازی فرق روا نہیں رہا ہے، اس بنار پر ہر شخص کے لئے خواہ وہ کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو اور کتنا ہی کم مقدور کیوں نہ ہو بلا تکلف اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی راہیں ہمیشہ کھلی رہی ہیں، مسلمانوں کی علمی تاریخ میں بے شمار ایسے علمار وفضلار ملیں گے جو آبائی طور پر مختلف ادنیٰ و اعلیٰ پیشوں سے تعلق رکھتے تھے،

ادنیٰ پیشوں سے تعلیم کی پابندی اٹھانا یورپ نے درحقیقت مسلمانوں ہی سے سیکھا ہے اور جس چیز کا سہرا یورپ کے سر پر باندھا جا رہا ہے، اگر مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ مدارس عربیہ ہی کا پرتو ہے، البتہ عمر کی قید اٹھا دینے کا فلسفہ ابھی دنیا کو ان مدارس سے سیکھنا باقی ہے اور گو "تعلیم بالغاں" کی شکل میں اس کی داغ بیل پڑ چکی ہے، تاہم حصول سند میں ابھی تک اس پر پابندی موجود ہے، بایں ہمہ اب وہ زمانہ زیادہ دور نہیں معلوم ہوتا جبکہ دنیا کی یونیورسٹیوں سے یہ لعنت بھی اٹھا دی جائے گی ۔!

امتحانات

امتحان جو طلبار کی تعلیمی استعداد اور اساتذہ کی محنت وجاں فشانی کے اندازہ کا معیار ہے اور جس پر ترقی درجات کا انحصار ہے بہت ضروری چیز ہے لیکن دار العلوم کو جس طرح حکومت کے اثر سے بالکل علیحدہ رکھا گیا ہے اسی طرح اس میں کسی قسم کی بیرونی مداخلت کو بھی پسند نہیں کیا گیا، نصاب تعلیم خود اس کا اپنا مجوزہ ہے، اور امتحانات بھی وہ خود ہی اپنی نگرانی میں لیتا ہے،

امتحانات دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک امتحان داخلہ، یہ ان طلباء کا ہوتا ہے جو کسی دوسرے مدرسہ سے آکر دارالعلوم میں داخل ہونا چاہیں، یہ امتحان عموماً شوال میں ہوتا ہے، اس امتحان میں خاص شدت برتی جاتی ہے، اور لبا اوقات نصف سے زائد طلباء ایسے ہوتے ہیں جن کو امتحان داخلہ میں ناکام ہونے کے باعث واپس ہو جانا پڑتا ہے دوسرا امتحان خواندگی ہوتا ہے، یہ سال میں تین مرتبہ لیا جاتا ہے، سہ ماہی ماہ صفر المظفر میں ششماہی ماہ جمادی الاولیٰ میں اور سالانہ رجب کے آخری ہفتہ سے شروع ہو کر شعبان کے عشرۂ دوم میں ختم ہوتا ہے۔

امتحانات میں انتہائی احتیاط اور سخت ترین نگرانی کی جاتی ہے، کافیہ شرح تہذیب اصول الشاشی، شرح جامی بحث فعل، کنز الدقائق اور نفحۃ الیمن وغیرہ تک یعنی پہلے اور دوسرے سال کی تمام اور تیسرے سال کی چند کتابوں تک امتحان تقریری، یعنی زبانی سوال وجواب کے ذریعہ لیا جاتا ہے، بڑی جماعتوں کا امتحان تحریری ہوتا ہے، سوالات کے پرچے نہایت حزم واحتیاط کے ساتھ چھپوائے جاتے ہیں۔

تحریری امتحان میں جوابات کے لئے ۵ گھنٹے کا وقت دیا جاتا ہے، نشستیں متعین ہوتی ہیں اور اس کا خاص اہتمام رکھا جاتا ہے کہ طالب علم ایک دوسرے سے بات کرنے پائیں، خلاف ورزی کی صورت میں، امتحان سے محروم کر دیا جاتا ہے،

جوابات کے نمبروں کا معیار ۵۰ ہے خصوصی جوابات کے لئے امتیازی طور پر ۳ نمبر تک زائد بھی دیے جاتے ہیں۔ درجۂ اول کی کامیابی کا معیار ۵۰ نمبر سمجھے جاتے ہیں۔ درجۂ اوسط ۴۵۔ اور درجۂ ادنیٰ کے ۴۰ نمبر ہیں، ۴۰ نمبر سے کم پانے والا امتحان میں کامیاب نہیں کیا جاتا اور نہ اس کو مستحق انعام سمجھا جاتا ہے۔

دار العلوم میں امتحان کے قواعد یونیورسٹیوں کے امتحانات سے فی الجملہ زیادہ سخت ہیں، یونیورسٹی کے امتحان میں ایک مضمون سے متعلق متعدد سوالات ہوتے ہیں اور ہر سوال کے نمبر متعین ہوتے ہیں نیز طالب علم کو اس کا بھی حق ہوتا ہے کہ جواب کے لئے ان میں سے اپنی مرضی کے مطابق سوالات کا انتخاب کرے، پورے سوالات کے جوابات دینے لازمی نہیں ہوتے، لیکن دار العلوم کے امتحان میں ہر کتاب سے متعلق تین سوال ہوتے ہیں اور ہر پرچہ میں تینوں کا حل کرنا اس لئے لازمی ہوتا ہے کہ تینوں کے نمبر مشترکہ ہوتے ہیں، اگر ایک سوال بھی چھوڑ دیا جائے تو طالب علم فیل ہو جاتا ہے کامیابی کے نمبروں کا معیار ۴۰ فیصد رکھا گیا ہے جو یونیورسٹیوں کے ۳۳ فیصد سے کہیں زیادہ ہے۔

اگر کسی کتاب میں ۳۰ نمبر مل سکے ہوں تو اس صورت میں طالب علم کو مافوق کتاب پڑھنے کی اس شرط کے ساتھ اجازت مل جاتی ہے کہ اس کتاب میں مکرر سالانہ امتحان دے کر کامیابی حاصل کرنی ہوگی، گویا یونیورسٹی کی موجودہ اصطلاح میں اس کو "کمپارٹمنٹ" سمجھنا چاہیئے، ۳۰ نمبروں سے کم ہونے کی صورت میں کتاب کا اعادہ کرنا ناگزیر ہے۔

اس موقع پر یہ معلوم رہنا چاہیئے کہ دار العلوم سے پہلے ہندوستان میں جتنے تعلیمی مرکز تھے ان کی حیثیت بالعموم شخصی درس گاہوں کی تھی، اور یہ امر سب میں بطور قدر مشترک کے تھا کہ نہ ان میں جماعت بندی تھی، نہ حاضری کے رجسٹر ہوتے تھے، نہ طلبا کو مجبور کیا جاتا تھا کہ فلاں کتاب اور فن کے ساتھ فلاں کتاب اور فن کا لینا ضروری ہے، مطلق آزادی تھی جس کا جو جی چاہتا تھا پڑھتا تھا، اور جب تک چاہتا پڑھتا، تعلیم کی کوئی مدت معین نہ تھی، اور امتحان کا بھی کوئی خاص دستور نہ تھا، جماعت بندی، مدت تعلیم، حاضری اور امتحان کے التزام اور تناسب مضامین وغیرہ امور کے اجرا کی اولیت

دارالعلوم ہی کو حاصل ہے، اور یہیں سے مدارس عربیہ میں یہ امور بتدریج رواج پذیر ہوئے ہیں۔[1]

تعلیمی وظائف

قوم کی بدقسمتی سے مدارس عربیہ میں تعلیم پانے والے طلباء اکثر و بیشتر غریب اور نادار ہوتے ہیں ان کے سرپرستوں میں اتنی استطاعت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے نونہالوں کی تعلیم و تربیت میں روپیہ خرچ کر کے ان کو تعلیم و تہذیب سے آراستہ کر سکیں

ہر ترقی کرنے والی قوم کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ اس کی ترقی کا راز اس قوم کے عوام کے تعلیم یافتہ ہونے میں مضمر ہوتا ہے، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک تعلیم کا مفت انتظام نہ ہو، چنانچہ صدہا برس کے تجربہ کے بعد بیسویں صدی کے بڑے بڑے ماہرین تعلیم بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عوام کی تعلیم مفت ہونی چاہیئے، اور جب تک یہ طریقہ اختیار نہ کیا جائے گا، تعلیم کا عام ہونا مشکل ہے، جدید تعلیم کا سب سے بڑا نقص

---

[1] بی جاپور کی تاریخ بستان السلاطین میں وہاں کے مدارس کے حالات میں لکھا ہے کہ

"امتحان بتاریخ سلخ ذی الحجہ می شد۔"

یعنی ذی الحجہ کے ختم پر طلباء کا امتحان ہوتا تھا، دوسری جگہ امتحان سالانہ ہونے کی بھی تصریح کی ہے کہ

"ہر سال امتحان می شد۔" (بحوالہ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول ص ۳۴۱)

مگر ہندوستان کے مدارس میں غالباً بی جاپور ہی کے مدارس کی یہ خصوصیت تھی کہ ان میں سالانہ امتحان ہوتا تھا، ورنہ دوسرے مدارس کے متعلق تاریخ میں سالانہ امتحان کا کوئی ذکر نہیں ملتا، اور یہ تو بالکل یقینی ہے کہ دارالعلوم کے قیام کے متصل زمانہ میں ہندوستان میں سالانہ امتحان کا قطعاً رواج نہ تھا، ۱۲ "م"

یہ ہے کہ وہ صرف ان لوگوں کے لئے خاص ہو کر رہ گئی ہے جو اپنے اخراجات کے خود متحمل ہو سکیں گویا عصری تعلیم کے حصول میں غریبوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

لیکن ہمارے قدیم تعلیمی نظام میں تعلیمی مصارف کو طلباء کے بجائے درس گاہوں کے ذمہ رکھا گیا ہے، اس تعلیمی نظام میں تعلیم پر کوئی فیس نہیں لی جاتی، اور نہ صرف یہ بلکہ طلباء کے لئے زیر درس کتابوں کا انتظام بھی مفت کیا جاتا ہے، پھر نہ صرف یہ کہ تعلیم مفت ہے اور قیام گاہ (بورڈنگ ہاؤس) کا کوئی کرایہ نہیں لیا جاتا، بلکہ نادار اور غریب طلباء کو درس گاہوں کی جانب سے کھانا کپڑا، اور دوسری ضروریات کے لئے نقد وظائف بھی دیئے جاتے ہیں۔ دارالعلوم میں شروع ہی سے اس امر کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ غریب اور نادار طلباء کے قیام و طعام، لباس، مصارف علاج اور دوسری لازمی ضروریات کے تکفل کا بار طلباء کے بجائے دارالعلوم کی جانب سے برداشت کیا جائے، الا یہ کہ جو طلباء خود اپنے تکفل پر قدرت رکھتے ہوں۔

مگر اجرائے وظائف میں یہ لحاظ رکھنا ناگزیر ہے کہ طلباء میں تعلیمی امور سے بے رغبتی اور مفت خوری کی عادت پیدا نہ ہونے پائے اور وہ ہمہ تن تعلیمی مشاغل میں منہمک رہیں، اس لئے تمام وظائف ایک سال کے لئے جاری کئے جاتے ہیں، سال آئندہ میں ان کی از سر نو تجدید کرانی ہوتی ہے، طالب علم اگر کسی وقت بھی امتحان میں ناکامیاب ہوتا ہے تو وظیفہ بند کر دیا جاتا ہے اور جب تک وہ اجرائے امداد کے قانون کے مطابق اوسط درجہ کی کامیابی امتحان میں حاصل نہ کر لے وظیفہ جاری نہیں ہوتا، البتہ دارالاقامہ میں قیام کے لئے جگہ اور کتب خانہ سے سال متعلقہ کی زیر درس کتابیں بلا تخصیص مستحق و غیر مستحق ہر طالب علم کو مستعار طریقہ پر مفت دی جاتی ہیں،

وظیفہ حاصل کرنے کے لئے حسب ذیل شرائط ضروری ہیں۔

الف :- طالب علم کم از کم کافیہ اور شرح تہذیب وغیرہ کتب جو دوسرے سال کے اوائل میں پڑھائی جاتی ہیں، پڑھ چکا ہو۔

ب :- مذکورہ کتب کے امتحان میں ۵۰ نمبروں میں کم از کم ۴۵ نمبر حاصل کئے ہوں جو کامیابی کا درجۂ اوسط ہے۔

ج :- بربنائے عزبت و ناداری امداد کا طلب گار ہو۔

وظیفہ کی دو قسمیں ہیں کھانا [1] ــــــــ اور ــــــــ نقد [2]

کھانے کے انتظام کے لئے مطبخ ہے جس سے ہر طالب علم کو ایک وقت میں دو تنوری روٹیاں دی جاتی ہیں جو ۲۲ تولہ (خشک) آٹے کی ہوتی ہیں، دوپہر کو دال اور شام کے کھانے میں گوشت دیا جاتا ہے۔

نقد وظیفہ جو عموماً مقامی اور بعض بیرونی طلباء بھی لیتے ہیں دو روپے سے لیکر پانچ روپے تک ہوتا ہے،

یہ دونوں قسم کے وظائف دار العلوم کی اصطلاح میں "امداد" کہلاتے ہیں جن طلباء کی امداد جاری ہو جاتی ہے ان کو سال بھر میں چار جوڑے کپڑے تیار شدہ دو جوڑی جوتے اور سردی کے موسم میں ایک روئی کا لحاف بھی دیا جاتا ہے۔

حجروں میں روشنی، اور کپڑوں کی دھلائی کے لئے دس آنے ماہوار وظیفہ مقرر ہے،

ممالک غیر کے طلباء کو وظیفہ چاء کے نام سے ایک روپیہ ماہانہ مزید ملتا ہے،

بیمار طلباء کے علاج کے لئے معالج مقرر ہے، امدادی طلباء کو دوا مفت مہیا کی جاتی ہے، اور کھانا پرہیزی ملتا ہے،

ان امور کے علاوہ احاطۂ دارالعلوم کی تمام گزرگاہوں میں روشنی، اقامت گاہوں میں پانی کے نل اور موسم سرما میں مسجد دارالعلوم میں گرم پانی کا انتظام بھی التزام کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

تقسیم انعام

طلبا میں تعلیمی مشاغل کی نسبت ترغیب و تحریص اور باہم دگر مسابقت کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے سالانہ امتحان میں کامیابی پر طلبا، کو مستحق انعام سمجھا جاتا ہے۔

انعام حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جن کتابوں میں امتحان دیا گیا ہے ان میں کم از کم دو تہائی کتابوں میں طالب علم پاس ہو، عطاء انعام میں طالب علم کی علمی استعداد کے مطابق کتابیں اور سند انعام دی جاتی ہے،

جس طالب علم کے پانچ یا اس سے زائد کتابوں میں ۵۰، ۵۰ یا اس سے زائد نمبر آئے ہوں اور کسی کتاب میں فیل بھی نہ ہو اس کو حسب موقع و گنجائش خصوصی انعام دیا جاتا ہے،

اسی طرح دورۂ حدیث کے جو طلبا، کتب دورہ میں ۵۰۰ نمبر مجموعی طور پر حاصل کر لیں تو وہ انعام عام کے علاوہ خصوصی انعام کے بھی مستحق سمجھے جاتے ہیں

دارالعلوم میں بعض دوسرے امور کی طرح شروع ہی سے تقسیم انعام کا بھی رواج ہے، تقسیم انعام کے عنوان سے ہر سال جو جلسہ منعقد کیا جاتا ہے اس میں مقامی لوگوں کے علاوہ بیرونی مقامات کے لوگوں کو خصوصیت کے ساتھ دعوتِ شرکت دی جاتی ہے، اس اجتماع کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسلمان عموماً اور چندہ دہندگان خصوصاً اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ انھوں نے اپنی جس نوخیز نسل کو دارالعلوم کے سپرد کیا تھا اس کے تعلیمی نتائج کیا برآمد ہوئے، نیز یہ کہ قوم نے جو روپیہ دارالعلوم کو دیا ہے، اس کے مصرف کا منظر وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے!

عطاءِ سند و دستار

جو طلباء نصاب دارالعلوم کی تکمیل کر کے سالانہ امتحانوں میں کامیابی حاصل کر چکتے ہیں ان کو فراغتِ تعلیم کے بعد سند دی جاتی ہے، سند میں ہر پڑھی ہوئی کتاب کے نام کے اندراج کا التزام رکھا جاتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ جس کتاب کے امتحان میں ۳۳ نمبر سے کم ہوں وہ داخل سند نہیں کی جاتی،

درجۂ فارسی، درجۂ تجوید اور درجۂ طب کی علیحدہ علیحدہ سندات بھی حسب الطلب مل سکتی ہیں۔ جو طلباء تکمیل سے قبل درمیان میں دارالعلوم کو چھوڑ دیتے ہیں ان کی طلب پر ان کو امتحان میں کامیاب کتب کا سارٹیفکٹ بھی دے دیا جاتا ہے،

سند میں امتحان دادہ کتابوں کے ساتھ طالب علم کی علمی اور ذہنی استعداد اور حسنِ قابلیت کا ذکر ہوتا ہے اور اس بات کی شہادت دی جاتی ہے کہ اس نے دارالعلوم میں تعلیم پائی ہے علوم و فنون میں مہارت رکھتا ہے، درس و تدریس اور افتاء کا اس کو حق حاصل ہے اس کے علاوہ اس کے اخلاق، چال چلن کے متعلق بھی اظہار رائے کیا جاتا ہے، سند مطبوعہ ہوتی ہے جو اساتذہ اور مہتمم کے دستخط اور دارالعلوم کی مہر سے مزین ہوتی ہے، اگر طالب علم سے قبل حصولِ سند کوئی ایسا غیر معمولی جرم سرزد ہو جائے جو علمی شان کے منافی ہو تو اس کو حصول سند سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

جو طلباء علوم و فنون میں امتیازی استعداد کے مالک ہوتے ہیں ان کو سند دینے کے علاوہ قدیم درس گاہوں کے معمول کے مطابق مجمع عام میں اساتذہ کے ہاتھوں سے ان کے سروں پر دستار باندھی جاتی ہے جو مدارس عربیہ کی اصطلاح میں "دستارِ فضیلت" سے موسوم ہے۔

نظم ونسق

مجلس شوریٰ دار العلوم کا نظم ونسق شروع ہی سے وامرھم شوریٰ بینھم کے شورائی اصول پر قائم ہے، اس کے لئے ایک با اختیار مجلس اعلیٰ ہے، جس کی تشکیل قیام دار العلوم کے ساتھ ہی عمل میں آگئی تھی۔ یہ جماعت مجلس شوریٰ کے نام سے موسوم ہے۔

یہاں یہ جتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ دار العلوم کا آغاز جس معمولی حالت اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا تھا اس کو دیکھتے ہوئے دار العلوم کے نظم ونسق کا مشاورت کے اصول پر مبنی ہونا تعجب خیز معلوم ہوتا ہے، ہندوستان میں اس وقت جمہوری نظام کا نہ تو کوئی نمونہ موجود تھا اور نہ لوگ عام طور پر اس طرز سے آشنا اور مانوس تھے، دار العلوم نے اسلامی طرز پر مجلس شوریٰ کی بنیاد رکھی اور اس نظام کو کامیابی کے ساتھ چلا کر قوم کے سامنے ایک عمدہ مثال قائم کردی، ارباب مشورہ کے لئے جن صفات سے متصف ہونا ضروری ہے اس کی نسبت قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ اپنے تحریر فرمودہ دستور العمل کی تیسری دفعہ میں فرماتے ہیں کہ

"مشیران مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو، اپنی بات کی پیچ نہ کی جائے خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفتِ رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنا میں تزلزل آجائے گا۔"

القصہ تہ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کے پس وپیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ

رہے سخن پروری نہ ہو، اور اس لئے ضروری ہے کہ اہل مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متأمل نہ ہوں، اور سامعین بہ نیت نیک اس کو سنیں، یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہماری مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل وجان قبول کریں گے اور نیز اسی وجہ سے یہ ضرور ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے، خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد وصادر جو علم و عقل رکھتا ہو، اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو، اور نیز اسی وجہ سے ضروری ہے کہ اگر اتفاقاً کسی اہل مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئے اور بقدر ضرورت اہل مشورہ کی مقدار معتد بہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا، ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہل مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔"

جمہوری نظام کے یہ وہ عمدہ اصول ہیں جن سے بہتر کوئی دوسرا طریق کار نہیں ہو سکتا، آج جمہوریت میں جو نقائص بیان کئے جاتے ہیں وہ اسی روح کے فقدان کا نتیجہ ہے، اس پر تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں ہے، تاہم اس قدر عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اگر جمہوریت کی اس روح سے قطع نظر کر لی جائے تو پھر وہ درحقیقت جمہوریت نہیں رہتی، چنانچہ اسی وجہ سے بعض ملکوں سے جمہوریت کا اعتبار اٹھتا جا رہا ہے۔

دارالعلوم کی مجلس شوریٰ ایک طرف تو چندہ دینے والوں کی نمائندگی کرتی ہے، اُسے چندہ دہندگان کے شرعی وکیل کی حیثیت حاصل ہے اور دوسری جانب دارالعلوم کے آمد وصرف اور اہم انتظامی امور کے متعلق کثرت رائے سے اپنے فیصلے صادر کرتی ہے، انتظامی آئین وضوابط وضع کرتی ہے، دارالعلوم کے جملہ اوقاف اور جائدادیں اسی کی تولیت ونگرانی میں ہیں اور یہی مجلس دارالعلوم کے مسلک کی حفاظت اور ملازمین کے عزل ونصب کی ذمہ دار ہے، مجلس شوریٰ

کا اجلاس سال بھر میں کم از کم دو مرتبہ لازمی ہے۔

مجلس شوریٰ کے ابتدائی ارکان

یہ مجلس ابتدا ئً یعنی قیام کے وقت حسب ذیل سات اراکین پر مشتمل تھی۔

(۱)۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہٗ ـــــ آپ کی ذات گرامی تعارف سے مستغنی ہے،

(۲)۔ حضرت حاجی عابد حسین رحمۃ اللہ علیہ ـــــ دیوبند کے نہایت متقی، پرہیزگار، اور صاحب اثر بزرگ تھے، خاندان سادات سے تعلق تھا، تعویذات اور عملیات کے فن میں دُور دُور تک شہرت تھی، دارالعلوم کا منصب اہتمام اولاً آپ ہی کو تفویض ہوا تھا۔

(۳)۔ مولانا مہتاب علی صاحبؒ ـــــ دارالعلوم کے قیام سے قبل دیوبند میں آپ کا ابتدائی تعلیم کا مکتب جاری تھا، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے عم اکبر تھے،

(۴)۔ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ ـــــ حضرت شیخ الہندؒ کے والد ماجد تھے، دہلی کے عربک کالج میں تعلیم پائی تھی، عربی کے زبردست ادیب تھے، دیوان متنبی وحماسہ وغیرہ متعدد کتابوں کے اردو ترجمے کئے، محکمہ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدہ پر فائز تھے تا زندگی مجلس شوریٰ کے رکن رہے، دارالعلوم کے بانیوں میں تھے،

(۵)۔ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ ـــــ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کے والد ماجد تھے، قیام دارالعلوم کی تحریک میں یہ بھی شریک تھے، انھوں نے بھی دہلی کے عربک کالج میں تعلیم پائی تھی، محکمہ تعلیم میں مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر تھے، فارسی اور اردو کے باکمال شاعر تھے، زندگی بھر دارالعلوم سے وابستہ رہے۔

(۶)۔ منشی سید فضل حق صاحب ـــــ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ سے شرف بیعت حاصل تھا، ابتدائً حضرت حاجی صاحبؒ کے زمانۂ اہتمام میں سربراہ کار کے منصب

پر مقرر ہوئے، اور ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۳ء میں مہتمم بنائے گئے۔

(۷) شیخ نہال احمد صاحبؒ —— دیوبند کے بہت بڑے اور ذی اثر رئیس تھے، شیوخ عثمانی میں ان کے بعد پھر کوئی ایسا شخص نہیں گذرا، ان کی سخاوت و فیاضی کے واقعات دیوبند میں خاص و عام کے زبان زد ہیں، دارالعلوم سے نہایت مخلصانہ تعلق تھا،

مذکورۂ صدر تعداد میں اضافہ ہوتا رہا، اس وقت مجلس شوریٰ کے اراکین کی تعداد ۲۱ ہے۔ دستور کی رُو سے مجلس شوریٰ میں کم از کم گیارہ ۱۱ اراکین کا عالم ہونا ضروری ہے، بقیہ ۱۰ ارکن ایسے غیر عالم حضرات ہوتے ہیں جو انتظامی اور تعلیمی امور میں بصیرت و مہارت رکھتے ہوں، اس تعداد میں مہتمم اور صدر مدرس کے علاوہ ۲ رکن بالعموم مقامی ہوتے ہیں، انعقاد جلسہ کے لئے اراکین کی کم از کم ایک تہائی تعداد کا شریک اجلاس ہونا ضروری ہے۔

مجلس انتظامیہ مجلس شوریٰ کے ماتحت ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۷ء سے ایک مجلس "مجلس انتظامیہ" کے نام سے قائم ہے، اس کے اراکین کی تعداد آٹھ ۸ ہے، ہر تیسرے مہینے اس کا اجلاس ہوتا ہے، اس مجلس کا کام مجلس شوریٰ کے کاموں میں اعانت و امداد بہم پہنچانا ہے۔

شعبہ جات

دارالعلوم کا وسیع نظام اٹھارہ ۱۸ شعبوں پر منقسم ہے، ہر شعبہ جو اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے اس کا ذمہ دار ناظم شعبہ ہوتا ہے، یہ شعبے بلحاظ نوعیت تین دائروں میں تقسیم ہیں، تعلیمات، مالیات، اور انتظامیات،

الف۔ تعلیمات ۱، جمعیۃ الطلباء ۲، طب ۳، صنعت وحرفت ۴، کتابت ۵ تعلیمی۔ اور دارالافتاء ۱

تبلیغ، کتب خانہ علمی شعبے ہیں۔

ب۔ محاسبی، تنظیم و ترقی، اوقاف، مطبخ اور تعمیرات مالیات کے شعبے ہیں۔

محاسبی کا تعلق آمد و صرف دونوں سے ہے، تنظیم و ترقی اور اوقاف آمدنی کے شعبے ہیں، تعمیرات اور مطبخ کا تعلق مصارف سے ہے،

ج۔ انتظامیات سے تعلق رکھنے والے شعبے یہ ہیں۔

اہتمام، محافظ خانہ، دار الاقامہ، صفائی، روشنی اور پانی

شعبۂ تعلیمات تعلیمی ادارہ کی حیثیت سے دار العلوم کا بنیادی نقطہ اور اساسی مقصد تعلیم و تدریس ہے، اس لئے دار العلوم کی تاسیس کے ساتھ ہی اس شعبہ کا بھی آغاز سمجھنا چاہیئے جیسا کہ شروع میں عرض کیا جا چکا ہے، شعبۂ تعلیمات کی ابتداء صرف ایک استاذ اور ایک شاگرد سے ہوئی تھی، مگر بعونہ تعالیٰ دار العلوم کا ہر قدم پچھلے قدم کے مقابلہ میں ترقی پذیر رہا، اور اب اس شعبہ کے درجات عربی میں تئیس ۲۳، درجہ فارسی میں پانچ ۵، درجۂ قرآن مجید و تجوید میں آٹھ ۸ اساتذہ درس و تدریس میں مشغول ہیں، طلباء کی تعداد بھی کم و بیش ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ رہتی ہے،

اساتذہ کے علاوہ تعلیمات سے متعلق دفتری امور کی انجام دہی کے لئے شعبہ تعلیمات میں اس وقت سات ۷ کارکنوں کا عملہ کام کر رہا ہے، صدر المدرسین شعبۂ تعلیمات کے ناظم ہوتے ہیں اور نائب صدر مدرس نائب ناظم، اس وقت حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی صدارت تدریس و نظامت تعلیمات، اور حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب نیابت کی مسند پر رونق افروز ہیں۔

شعبۂ طب عربی زبان کی ایک مشہور ضرب المثل ہے "العلم علمان، علم الادیان

وعلم الابدان، یعنی علم دو ہی ہیں، ایک مذاہب کا علم جس کا تعلق روح اور تزکیۂ اخلاق سے ہے، دوسرا انسانی جسم کا علم جو صحت و مرض سے تعلق رکھتا ہے ظاہر ہے کہ یہ دونوں علم اپنی اپنی جگہ پر اہمیت رکھتے ہیں، پھر یوں بھی علم طب ایک باعزت ذریعۂ معاش اور نفع رساں انسانی خدمت ہے، دار العلوم میں دینی علوم و فنون کی طرح طب کی تعلیم کا بھی مستقل انتظام ہے۔

اس شعبہ سے دو کام متعلق ہیں، طلباء کو طبی کتابوں کی تعلیم اور مریض طلباء کا معالجہ، ۱۳۶۷ھ میں مجموعی طور پر ۲۲۳۶ مریض طلباء اس شعبہ میں زیر علاج رہے، روزانہ حاضری کے حساب سے مریضوں کا شمار سال بھر میں ۹۱۲۹ ہوتا ہے، ان کے معالجہ پر ۸۶۳ روپے ۹ آنے ۳ پائی صرف ہوئے گویا فی مریض ڈیڑھ آنہ یومیہ نسخہ کا اوسط ہے، اور اوسطاً ہر مریض کی صحت یابی پر ۶؍ آنے ۲ پائی صرف ہوئے، مابعد جنگ کی ہوش ربا گرانی کے زمانے میں مصارف کی یہ حیرت انگیز کفائت دار العلوم کا اعجاز اور مولانا حکیم محمد عمر صاحب طبیب دار العلوم کا نادر دست کارنامہ ہے، معالجاتی اداروں میں اس قدر ارزاں علاج کی کوئی دوسری مثال غالباً موجود نہیں ہے،

جمیعۃ الطلباء طلباء میں تقریر و تحریر کا ملکہ، خطابت و طرز ادا کی مشق اور معلومات علمی کی ترقی ہی اسلامی تبلیغ اور پیغام حق و صداقت کی اشاعت کا ذریعہ ہیں۔ اس لئے دار العلوم میں درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کی طرح تحریر و تقریر کو بھی اہم ترین تمرینی جزو قرار دیا گیا ہے، علاوہ ازیں زمانہ کے احوال و مقتضیات کے پیش نظر ضروری ہے کہ طلباء میں مجالس و محافل کے نظم و نسق کا خاص سلیقہ ہو تاکہ وہ اپنے فرائض دعوت و ارشاد کو خوش اسلوبی کے ساتھ موجودہ دنیا کے سامنے

پیش کرنے کے اہل ثابت ہوسکیں۔

جمیعۃ الطلباء کے چار شعبے ہیں۔

(۱)۔ شعبۂ تقریر عربی و اردو،

(۲)۔ شعبۂ تحریر عربی و اردو،

(۳)۔ شعبۂ مذاکرہ۔

(۴)۔ شعبۂ مطالعہ،

لیکن یہ نظام اس حد تک محدود رکھا گیا ہے کہ اصل مقصد تعلیم میں کوئی فرق نہ پڑنے پائے، ہر پنج شنبہ کی شب میں جمیعۃ الطلباء کا اجلاس ہوتا ہے، جس میں دینی و اصلاحی مسائل کے علاوہ ملّی، تاریخی، سیاسی اور عمرانی مباحث میں علمی و تحقیقی انداز میں طلباء حصہ لیتے ہیں،

صنعت وحرفت زمانہ کے مقتضیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے دار العلوم میں صنعت وحرفت کے اجراء کی ضرورت عرصہ سے محسوس کی جارہی تھی تاکہ فضلائے دار العلوم صنعت وحرفت کو ذریعہ معاش بناکر استغنائے ظاہری کے ساتھ دین کی خدمت آزادی اور بے فکری سے انجام دے سکیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ تھا کہ جن صنعتوں کی تعلیم دی جائے وہ ایسی ہوں جو فی نفسہ طلباء اور علماء کے شایانِ شان ہوں اور ان کے سیکھنے میں جسمانی اعضاء کی حرکت کے ساتھ دماغی اور ذہنی فکر و تربیت بھی شامل ہو، نیز ان صنعتوں سے روزمرہ کی انسانی ضرورتوں کی فی الجملہ تکمیل بھی ہوتی ہو، اور اسی کے ساتھ ان میں زیادہ سے زیادہ افادیت کا پہلو موجود ہو۔

چنانچہ ۱۳۶۵ھ سے جلد سازی کے کام سے صنعت وحرفت کی تعلیم کا آغاز کردیا گیا، اس وقت تک یہ شعبہ جلد سازی کے علاوہ، خیاطی، گھڑی سازی، پارچہ بافی، ہوزری اور

جفت سازی کی صنعت تک ترقی کرچکا ہے امید ہے کہ عنقریب اپنی افادیت کے باعث انشاء العزیز طلباء کے معاشی مستقل کا باعزت ذریعہ بن سکے گا۔

شعبۂ کتابت کتابت یعنی خوش نویسی بھی درحقیقت صنعت ہی کی ایک صنف ہے مگر دارالعلوم میں یہ دو درجوں میں تقسیم ہے، اس لئے ایک علیحدہ شعبہ سمجھا جاتا ہے، پہلا درجہ ان طلباء کے ہے جو بدخطی اور تحریری نقائص کو حسنِ خط سے تبدیل کرنا چاہیں، دوسرے درجہ میں فن خوشنویسی کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے،

ہمارے قدیم تعلیمی نظام میں خط کی درستگی کو خاص اہمیت حاصل تھی "الخط نصف العلم" ایک مشہور مقولہ ہے جس میں "خط" کو نصف علم سے تعبیر کیا گیا ہے، پڑھنے کے ساتھ ساتھ خط کی عمدگی کی مشق بھی نہایت ضروری سمجھی جاتی تھی، عام لکھے پڑھے لوگوں سے لیکر سلاطین تک اس میں کمال حاصل کرتے تھے، چنانچہ خود ہندوستان میں سلطان نصیر الدین محمود اور اورنگ زیب عالمگیرؒ نہایت باکمال خطاط تھے، مگر اب کچھ عرصہ سے جس طرح اور بہت سے قدیم تصورات معدوم ہوتے جارہے ہیں، خط کی عمدگی اور پاکیزگی کی جانب سے بھی روز بروز بے اعتنائی بڑھتی جارہی ہے خصوصًا مدارس عربیہ میں تو تقریبًا مفقود ہی ہوگئی ہے،

دارالعلوم میں اس ضرورت کے اہمیت کے پیش نظر نستعلیق اور نسخ دونوں خطوں کی اصلاح اور تعلیم دی جاتی ہے، اس شعبہ میں ۲ استاد مامور ہیں، طلباء کو مشق خط کا سالانہ امتحان دینا ہوتا ہے۔

دارالافتاء دارالعلوم جس وقت قائم ہوا اس زمانہ میں پرانے علماء کی درس گاہیں ویران

اور مسندیں خالی ہو چکی تھیں علما رخال خال رہ گئے تھے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ مسئلہ تبلانے والا بھی مشکل سے ملتا تھا، اس لئے جوں ہی دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا لوگوں کی توجہ فوراً اس کی جانب مبذول ہوگئی اور ملک کے اطراف وجوانب سے طلب فتاویٰ کا ایک طویل سلسلہ قائم ہوگیا، جیسا کہ عموماً ہر ابتدائی کام میں ہوا کرتا ہے مستقل شعبہ کے قیام کے بجائے اولاً یہ کام اساتذہ کے سپرد رہا، چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدارت تدریس کے ساتھ فتویٰ نویسی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے، مگر جب طلب فتاویٰ کی تعداد غیر معمولی طور پر بڑھ گئی تو ۱۳۱۰ھ ۱۸۹۳ء میں دارالافتار کے عنوان سے مستقل شعبہ قائم کیا گیا، اور حضرت مولانا عزیزالرحمٰن صاحب عثمانی کا انتخاب اس اہم خدمت کے لئے عمل میں آیا، حضرت ممدوح اپنے زمانے کے یگانہ روزگار عالم اور زبردست فقیہ ہونے کے علاوہ زہد وتقویٰ میں بھی امتیازی حیثیت رکھتے تھے، اور ایک مقدس بزرگ سمجھے جاتے تھے،

دارالافتار سے جو فتاویٰ طلب کئے جاتے ہیں اُن میں روزمرہ کے معمولی مسائل کے علاوہ اہم پیچیدہ اور غور طلب مسائل، پنچائتوں کے فیصلے، عدالتوں کے اپیل اور مختلف الاحکام فتاویٰ کثرت سے ہوتے ہیں، دارالافتار کا فرض ہے کہ وہ دریافت کرنے والوں کو پوری تحقیق اور صحت کے ساتھ مسائل شرعیہ تبلائے، عوام کے علاوہ علما بھی اکثر مسائل میں اس کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ مگر اس اہمیت ونزاکت کے باوجود دارالافتار کا کام عام اور خاص مسلمانوں میں ہمیشہ اطمینان اور وقعت کی نظر سے دیکھا گیا ہے، جس نے دارالافتار کی مقبولیت اور شہرت وعظمت کو چار چاند لگا دیئے ہیں، ۱۳۲۹ھ ۱۹۱۱ء سے ۱۳۷۰ھ ۱۹۵۱ء تک جو فتاویٰ دارالافتار سے جاری ہوئے ان کی تعداد ۱۵۸۰۷۴۷ ہے۔

چند سالوں کے فتاویٰ ۹ جلدوں میں شائع ہو کر قبول عام حاصل کر چکے ہیں، فتاویٰ پر کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ دارالافتاء کی عمارت جو تین وسیع کمروں پر مشتمل ہے مسجد کی مشرقی جانب بالائی منزل پر واقع ہے، یہ عمارت ۱۳۶۵ھ کی تعمیر ہے۔

شعبۂ تبلیغ ۱۳۴۲ھ / ۱۹۲۴ء میں جب شدھی اور سنگھٹن کی منظم تحریکیں ملک میں جاری ہوئیں تو مسلمانوں کو ارتداد سے بچانے کے لئے شعبۂ تبلیغ قائم کیا گیا، چنانچہ اس شعبہ کی ان تھک جدوجہد سے لاکھوں مسلمانوں کے ارتداد سے محفوظ ہو جانے کے علاوہ ان میں دینی روح بیدار اور اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے میں اس وقت بڑی مدد ملی، آج ہندوستان اور پاکستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں دارالعلوم کے مبلغین نے پہنچ کر لوگوں کو کلمۂ حق نہ سنایا ہو۔ لاہور کے مشہور موقر روزنامہ "سیاست" کا بیان اوپر گذر چکا ہے جس نے لکھا تھا کہ "جہاں تک تحفظ دین، تردید مخالفین اور اصلاح مسلمین کا تعلق ہے دارالعلوم دیوبند کے مدرسین اور مبلّغین کا حصہ سارے ہندوستان سے بڑھ چڑھ کر ہے۔"

غرض کہ جس طرح دینیات کی تعلیم کی تاریخ میں دارالعلوم کی ہندوستان میں مثال نہیں ہے اسی طرح تبلیغی خدمات کی وسعت و کثرت میں بھی اس کی مثال اس صدی کی تاریخ میں نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں جہاں کہیں جلسے ہوتے ہیں اُن میں عموماً دارالعلوم کے حضرات کو خصوصیت سے بلایا جاتا ہے۔

شعبۂ کتب خانہ علم کی ترقی کا دارومدار کتب خانہ کی عمدگی پر موقوف ہے، چنانچہ دارالعلوم کا کتب خانہ اپنی نوعیت اور تعداد کے لحاظ سے ایک امتیازی شان کا مالک ہے، یہ ایک ایسا علمی سرمایہ ہے کہ اس پر جس قدر بھی فخر

کیا جائے کم ہے یہ دار العلوم کی "دانہ دانہ ہمی شود انبار" کی بہترین یادگار اور ہماری قومی عظمت اور علم دوست مسلمانوں کی فیاضی کا ایک ایسا نشان ہے کہ جو لوگ باہر سے آکر دیوبند جیسی معمولی بستی میں ایسا عظیم الشان کتب خانہ دیکھتے ہیں وہ دنگ رہجاتے ہیں، یہ ہوسکتا ہے کہ آپ اس کی معمولی عمارت، الماریوں کی ہیئت اور کتابوں کی سادہ جلدوں کو دیکھکر مرعوب نہ ہوں مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ مختلف زبانوں میں ہر علم و فن کی کتابوں کی کثرت اور ان کی غیر معمولی معنویت آپ کو متاثر نہ کرسکے۔ کتب خانہ میں ایک بڑی تعداد ان کتب کی بھی ہے جو سلطان محمد رشاد خاں ترکی، نظام دکن، سلطان ابن مسعود ملک نجد و حجاز اور موجودہ حکومت افغانستان کی عطا کردہ ہیں۔

غرض کہ کتب خانہ میں بیش بہا کتب کا ایک عظیم الشان ذخیرہ موجود ہے، جس میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے اس وقت کتابوں کی تعداد ۶۷ ہزار سے متجاوز ہو چکی ہے، ان میں مطبوعہ کتب بھی ہیں اور قلمی بھی، کم یاب بھی ہیں اور نادر الوجود بھی، بعض کتابیں فن خطاطی کے لحاظ سے قابلِ تعریف ہیں، تو بعض اپنی قدامتِ تحریر کے اعتبار سے لائقِ توجہ ہیں، بعض کتب مصنفین کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہیں، اور بعض نقاشی اور مصوری میں اپنا جواب نہیں رکھتیں، بعض کتب شاہی کتب خانوں کی زینت رہ چکی ہیں اور اس لئے تاریخی اہمیت کی مالک ہیں، اور بعض وہ ہیں جو مصنف کے اصل نسخہ سے منقول ہیں، چند کتابیں ایسی بھی ہیں جن کی نسبت وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ ان کی نقل آج دنیا کے کسی کتب خانہ میں موجود نہیں ہے، اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے کہ دار العلوم کا کتب خانہ دنیا کے بہترین کتب خانوں میں سے ایک ہے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا، بعض کتب پر چھ چھ سو اور سات سات سو برس گذر چکے ہیں لیکن کاغذ اپنی حالت پر قائم ہے سیاہی

کا یہ حال ہے کہ گویا لکھنے والا ابھی لکھ کر اُٹھا ہے، کاغذ اور حسنِ تحریر دیکھنے کے لائق ہے، کیا مجال کہ سیکڑوں صفحات لکھنے پر خط کی یکسانیت، سیاہی کے رنگ اور قلم میں ادنیٰ فرق پیدا ہو جائے

کاغذ کی ساخت اور خط کی شان میں عہد بعہد ترقی ہوتی گئی ہے، ان کتابوں سے اسلامی ممالک کی تہذیب تمدن اور علمی کاموں سے مسلمانوں کی دلچسپی اور شغف کا فی الجملہ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

زبان کے اعتبار سے یہ کتابیں مختلف زبانوں میں ہیں، اور گو بڑا ذخیرہ عربی، فارسی اور اُردو میں ہے تاہم عبرانی، ترکی، لاطینی، انگریزی، ہندی، گجراتی، سندھی پنجابی، پشتو، کنڑی، ٹامل، سنسکرت، اور بھاکا وغیرہ زبانوں کی کتابیں بھی کافی تعداد میں موجود ہیں

عام مشرقی کتب خانوں کی طرح کتابوں کی تقسیم فن وار ہے، یعنی ایک فن و موضوع سے تعلق رکھنے والی تمام کتابیں خواہ وہ کسی زبان میں ہوں اس فن کے تحت میں رکھی جاتی ہیں، کتب خانہ، بڑے بڑے ۲۸ فنون پر منقسم ہے، کتب خانہ کی عمارت ناکافی ہونے کے باعث اکثر فنون میں ان کے مناسب فنون کو شامل کر دینا پڑا ہے، مثلاً تاریخ میں محاضرات، سیر، سیرت، مناقب، سفر نامے اور جغرافیہ وغیرہ مستقل فنون شامل ہیں، یا مثلاً طب میں طب قدیم وجدید، ڈاکٹری، کیمیا اور بیطاری کی کتب مختلط ہیں، سیاسیات، معاشیات، اقتصادیات، نفسیات اور حکمت شرعیہ علوم علیحدہ علیحدہ ہونے کے بجائے علوم متفرقات کے ذیل میں رکھے گئے ہیں، غرض کہ ہر فن میں کم و بیش یہی صورت ہے،

ذیل میں فن وار کتب کے اعداد و شمار پیش ہیں جن سے ہر ایک فن کی علیحدہ علیحدہ کتب کی تعداد معلوم ہو سکتی ہے۔

(۱)۔ تفسیر و اصول تفسیر، علوم قرآن	۲۰۸۲	(۱۷)۔ ہیئت	۵۴
(۲)۔ تجوید و قرأت وغیرہ	۲۸۲	(۱۸)۔ ریاضی	۳۸۷
(۳)۔ اوراد و ظائف	۲۸۲	(۱۹)۔ مناظرہ اور مذاہب	۵۱۶۴
(۴)۔ حدیث و اصول حدیث	۳۵۴۴	(۲۰)۔ صرف	۹۶۱
(۵)۔ رجال	۲۷۸	(۲۱)۔ نحو	۶۷۶
(۶)۔ اصول فقہ	۲۹۸	(۲۲)۔ معانی و بیان	۱۵۶
(۷)۔ فقہ	۳۲۵۶	(۲۳)۔ عروض	۶۱
(۸)۔ فرائض	۲۶۲	(۲۴)۔ لغت	۹۷۵
(۹)۔ عقائد و کلام	۱۳۷۱	(۲۵)۔ ادب عربی	۱۲۵۹
(۱۰)۔ تاریخ و جغرافیہ وغیرہ	۳۹۲۲	(۲۶)۔ ادب فارسی	۱۵۵۲
(۱۱)۔ تصوف	۲۱۲۲	(۲۷)۔ ادب اردو	۷۹۵
(۱۲)۔ اخلاق	۱۷۵	(۲۸)۔ متفرقات	۳۹۶
(۱۳)۔ وعظ	۹۳۳		
(۱۴)۔ طب قدیم و طب جدید، کیمیا وغیرہ	۷۰۸	میزان	۳۲۸۱۸
(۱۵)۔ فلسفہ	۲۶۴		
(۱۶)۔ منطق	۶۰۳		

مذکورہ بالا تعداد غیر درسی کتب کی ہے، درسیات کی مجموعی تعداد اکتیس ہزار (۳۱۰۰۰) ہے ہر درسی کتاب کے نسخے اس جماعت کی تعداد کے مطابق موجود رکھے جاتے ہیں،

کتب خانہ کی عمارت پانچ وسیع کمروں پر مشتمل ہے جن میں فرش سے چھت تک بڑی بڑی دیو ہیکل الماریاں لگی ہوئی ہیں نظم ونسق کو درست رکھنے کے لئے ایک ناظم تین محرر اور ایک فراش ہے، دس بارہ ہزار کتابوں کا داد وستد کا سالانہ اوسط ہے[1]

شعبۂ محاسبی مسجد دار العلوم کے بالمقابل یعنی دار العلوم میں داخل ہونیکے وقت بائیں جانب بالائی منزل پر ایک کشادہ عمارت میں شعبہ محاسبی کا دفتر واقع ہے، یہ شعبہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت اہم ہے، قیام دار العلوم کے دوسرے ہی سال اس کی تشکیل عمل میں آگئی تھی، مالی داد وستد کے لحاظ سے اس شعبہ کا تعلق دار العلوم کے ہر شعبہ سے وابستہ ہے، ہر قسم کے آمد وصرف کی شعبہ وار اور مدوار تفصیلات رکھنا اس کے فرائض میں ہے، ادنیٰ سے ادنیٰ رقم اور معمولی سی معمولی چیز بھی بغیر رسید کے داخل نہیں کی جاتی، اسی طرح کوئی صرف بھی بغیر چیک کے نہیں کیا جاتا دار العلوم کا خزانہ اسی شعبہ کے واسطے سے مہتمم کی تحویل میں رہتا ہے، حسابات کے اندراجات مروجہ حسابی طریق کے مطابق نہایت واضح اور صاف رکھے جاتے ہیں اور جانچ پڑتال کیلئے اس کا دروازہ ہر شخص کے لئے کھلا رہتا ہے، اس کے باوجود مزید احتیاط کے طور پر

---

[1] کتب خانہ کا تعارف اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اس کی اصل روح پیش نہ کی جائے کتب خانہ کی روح در حقیقت اس کی کتابیں ہی تو ہیں، مگر ساری تو کجا خاص خاص کتابوں کے تعارف کی بھی یہاں گنجائش نہیں ہے، کتب خانہ کی تفصیلات کے لئے راقم السطور کی تصنیف "تاریخ دار العلوم" جو مستقل اسی موضوع پر ہے ملاحظہ فرمائی جائے۔ "م"

رجسٹرڈ ایڈیٹروں سے سالانہ حسابات چک کرائے جاتے ہیں، آمد وصرف کے اندراج کی تکمیل روز کے روز کردی جاتی ہے،

طلباء کے وظائف اور ان کے کپڑے کی تقسیم کا کام بھی اسی شعبہ سے متعلق ہے، دوسرے شعبوں کے ذریعہ سے جو مصارف ہوتے ہیں ان کی جانچ پڑتال بھی محاسبی کے فرائض میں داخل ہے۔

شعبۂ محاسبی کے حسابات کی عمدگی کو تقریباً ہر وارد وصادر نے سراہا ہے ایک مرتبہ کانپور کے مشہور تاجر حافظ محمد حلیم صاحب نے اپنے معائنہ میں لکھا تھا کہ

"مدرسہ کا حساب نہایت اطمینان بخش ہے، اندراج جمع وخرچ باقاعدہ ہوتا ہے، اور بڑی خوبی یہ ہے کہ معطی کا عطیہ اس کے حسب منشاء مصارف میں خرچ کیا جاتا ہے"

اس شعبہ میں ۸ کارکن کام کرتے ہیں، ناظم محاسبی ایک تجربہ کار محاسب ہیں، ان کو دارالعلوم کا بجٹ تیار کرنے میں خاص ملکہ حاصل ہے۔

شعبۂ تنظیم وترقی اس شعبہ کا کام یہ ہے کہ لٹریچر اور عملی کارروائی کے ذریعہ سے ملک میں دارالعلوم کے فضلاء اور بہی خواہوں کی ایک ایسی جماعت تیار کرے جو دارالعلوم کے اثرات کو زیادہ سے زیادہ ہمہ گیر بنانے میں مدد دے سکے، اور اس کی آمدنی میں اضافہ کی موجب ہو، توفیر آمدنی کے لئے سردست ۱۲ سفیر مامور ہیں، جن پر ملک کے مختلف حصوں کو تقسیم کردیا گیا ہے، یہ سفیر اپنے اپنے مقررہ علاقوں میں پہنچ کر کام کرتے ہیں، ہر سفیر کے لئے سال بھر میں کم از کم ڈھائی ہزار روپے کی فراہمی اور دوسو دن سفر میں گذارنا لازمی ہے، یہ سفراء ملک کے گوشہ گوشہ میں دورے کرکے اپنے مفید مقاصد کی اشاعت کرتے ہیں۔ اور کم وبیش ہر جگہ سے انھیں مالی اور اخلاقی امداد ملتی ہے،

۱۳۶۷ھ میں اس شعبہ کے ذریعہ سے تقریباً اسی ہزار روپے چندہ وصول ہوا، شعبہ تنظیم میں سفراء کے علاوہ دفتری امور کی تکمیل کے لئے ۵ کارکنوں کا عملہ مصروف عمل ہے۔

شعبۂ اوقاف

اوقاف کا سلسلہ دار العلوم کی عمارتوں کی تعمیر کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا، وقتاً فوقتاً اہل خیر اپنی اپنی چھوٹی چھوٹی جائدادیں دار العلوم کے لئے وقف کرتے رہے، البتہ کوئی ایسی جائداد جس کے ذریعہ سے دار العلوم کے معتد بہ مصارف پورے ہو سکیں اوقاف دار العلوم میں نہیں ہے، اوقاف کے ذریعہ سے اگرچہ بارہ چودہ ہزار روپے سالانہ کی آمدنی ہے، مگر یہ آمدنی کسی یک جائی علاقہ سے نہیں ہوتی، یہ اوقاف ہندوستان کے مختلف مقامات میں واقع ہیں، جس کی وجہ سے مصارف کا بار غیر معمولی طور پر بڑھ گیا ہے، اس شعبہ میں دو کارکن مامور ہیں۔

شعبہ مطبخ

مطبخ کے قیام سے پہلے بیرونی طلباء کے کھانے کا انتظام یہ تھا کہ کچھ طلباء کا کھانا تو اہل شہر کے ذمہ تھا، اہل خیر حضرات ایک ایک، دو دو طالب علم کو کھانا دیتے تھے اور کچھ طلباء کو نقد وظیفہ دے دیا جاتا تھا، جس سے اپنے کھانے کا وہ بطور خود انتظام کرتے تھے، یہ دوسری صورت طلباء کے لئے بے حد تکلیف دہ اور ان کی علمی زندگی کے انہماک میں نقصان رساں تھی اس دقت کو رفع کرنے کے لئے نقد وظیفہ کے بجائے ۱۳۲۸ھ (۱۹۱۱ء) میں مطبخ قائم کیا گیا، پہلے سال میں صرف ۲۵ - ۳۰ طلباء کا کھانا پکتا تھا، رفتہ رفتہ یہ تعداد اب سات سو تک پہنچ گئی ہے، صرف ایک طباخ سے اس کی ابتدا ہوئی تھی، لیکن اب ۲۲ - افراد کا عملہ اس میں لگا ہوا ہے

کھانا تقسیم کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ ہر طالب علم کے پاس ایلمونیم کا مدور ٹکٹ ہوتا ہے ٹکٹ صبح و شام کے لئے علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں ٹکٹوں پر صبح، شام کے الفاظ کی صراحت کے علاوہ اختلاف رنگ کے

ذریعہ بھی ان کو ممیز کر دیا گیا ہے، ٹکٹوں پر نمبر کندہ ہوتے ہیں اور ہر نمبر کے صبح و شام کے لئے دو ٹکٹ ہوتے ہیں، کھانا پانے والے طلباء کے رجسٹر ہیں جس نمبر پر طالب علم کا نام درج ہوتا ہے وہی نمبر اس طالب علم کے ٹکٹ کا ہوتا ہے تقسیم طعام کے کمرے کو کٹہرہ لگا کر اس طرح بنایا گیا ہے کہ ایک وقت میں صرف ایک ہی آدمی اس سے گذر سکے، ایک طرف سے داخل ہونے کا راستہ ہے اور دوسری جانب سے نکلنے کا، ٹکٹ داخل کرنے پر اگلے وقت کے لئے اسی نمبر کا دوسرا ٹکٹ دے دیا جاتا ہے، ٹکٹ گھر سے آگے بڑھنے پر مقسم طعام کھانا حوالہ کر دیتا ہے، اس طریق پر طلباء نہایت سکون اور راحت کے ساتھ کھانا حاصل کر لیتے ہیں اور چھ سات سو طلباء صرف گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں فارغ ہو جاتے ہیں،

ہر طالب علم کو ایک وقت میں دو تنوری روٹیاں دی جاتی ہیں جن کے خشک آٹے کا وزن ۲۲ تولہ ہوتا ہے، شام کے کھانے میں گوشت پکتا ہے اور دوپہر کو دال دی جاتی ہے، مطبخ میں قیمتاً کھانا لینے کا بھی انتظام ہے، جس میں مذکورہ بالا کھانے کے علاوہ دو اور قسم کا کھانا بفرق مراتب پکتا ہے، بیمار طلباء کے لئے پرہیزی کھانا بھی پکایا جاتا ہے، مطبخ کی عمارت احاطۂ دارالعلوم کے جنوبی گوشہ میں واقع ہے۔

شعبۂ تعمیر

دارالعلوم میں تعمیر عمارت کی نوعیت ہمیشہ یہ رہی ہے کہ وقتاً فوقتاً اہل خیر اس کی تعمیری ضروریات کی جانب توجہ فرماتے رہے اور بقدر آمدنی عمارتیں تیار ہوتی رہیں، یہ صورت نہیں ہوئی کہ افتتاح سے قبل عمارت کی تکمیل کر لی جائے جیسا کہ عموماً دستور ہے کہ مجوزہ نقشہ کے مطابق پہلے عمارت تیار کرائی جاتی ہے اس کے بعد تعلیم شروع ہوتی ہے بلکہ جوں جوں ضرورت پیش آتی رہی اور اللہ کے مخلص بندے اس کی تیاری پر آمادہ ہوتے رہے، بتدریج عمارتیں تعمیر ہوتی رہیں۔ چونکہ بالعموم ہر سال

یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اس لئے اس شعبہ میں حسب ضرورت کم و بیش افراد کام کرتے رہتے ہیں

مذکورہ شعبوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ان میں محاسبی کا تعلق آمد و صرف دونوں سے ہے تنظیم و ترقی اور اوقاف آمدنی کے شعبے ہیں، تعمیر اور مطبخ کا تعلق مصارف سے ہے۔

انتظامیات سے تعلق رکھنے والے شعبے یہ ہیں۔

ادارۂ اہتمام ادارۂ اہتمام دارالعلوم کا آئینی طور پر مرکزی نقطہ ہے، تمام شعبوں کا نظم و نسق، ان کی نگرانی اور حسابات کی جانچ پڑتال اسی ادارہ سے متعلق ہے، مجلس شوریٰ و انتظامیہ کی تجاویز اور فیصلے ادارۂ اہتمام ہی کے ذریعہ سے نافذ کئے جاتے ہیں، شعبوں کی داخلی نگرانی کے علاوہ دارالعلوم کے ملک سے خارجی تعلقات بھی اسی ادارہ کے واسطے سے قائم ہیں، بناء بریں اہتمام ایک خاص اہمیت کا حامل ہے، اہتمام کے اہم منصب کے لئے ہمیشہ یہ اصول مدنظر رہا ہے کہ اس پر ایسی شخصیتوں کا انتخاب کیا جاتا ہے جو علم و فضل، دیانت و تقویٰ اور انتظامی امور میں خاص صلاحیتوں کی مالک ہونے کے علاوہ ملک میں خاص اثر اور وجاہت بھی رکھتی ہوں۔

ادارۂ اہتمام کی عمارت مسجد دارالعلوم کے عقب میں اندرونی صدر دروازہ کے اوپر واقع ہے،

محافظ خانہ دفتری حیثیت سے محافظ خانہ کو روداد دارالعلوم میں "انتظام کی روح" سے تعبیر کیا گیا ہے، اس شعبہ میں دارالعلوم کا ۹۰ سال کا تاریخی سرمایہ محفوظ ہے، محافظ خانہ ادارۂ اہتمام سے ملحق ایک دو منزلہ کمرہ میں واقع ہے، دارالعلوم کے تمام شعبہ جات کے سابقہ کاغذات اور دستاویزات اسی شعبہ میں محفوظ رکھے جاتے ہیں، ہر شعبہ کے کاغذات کے لئے ایک رنگ خاص کر دیا گیا ہے

جس شعبہ کا کاغذ ہوتا ہے اُسی کے مخصوص رنگ کی اس پر چٹ لگائی جاتی ہے ان رنگوں کی وجہ سے ہر شعبہ کے کاغذات بآسانی پہچانے جا سکتے ہیں، اور ان کی برآمدگی میں ادنیٰ دشواری پیش نہیں آتی۔

اس وقت محافظ خانہ کی ذمہ دارانہ خدمات راقم السطور سے متعلق ہیں۔

شعبۂ دار الاقامہ

دار الاقامہ آٹھ وسیع احاطوں اور ۲۱۰ کمروں پر مشتمل ہے جن میں کم و بیش آٹھ سو طلبار کا قیام رہتا ہے، طلبا کو لئے کمروں کی تجویز و تعیین، ان کی اخلاقی نگرانی اور فصل خصومات دار الاقامہ سے تعلق رکھتے ہیں، جو اساتذہ کے ذریعہ سے انجام دیئے جاتے ہیں، قانون کا احترام، اکابر کی اطاعت باہمی محبت و اخلاص اور رواداری کو طلبائے دار العلوم کے اخلاقی نظام کے مخصوص اوصاف ہیں، طلبار کے نظم کی استواری اور پختگی کو دیکھ کر ایک مرتبہ صاحبِ زادہ آفتاب احمد خاں صاحب وائس چانسلر علی گڈھ یونیورسٹی نے فرمایا تھا کہ "دار العلوم میں جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ طلبار کا ڈسپلن ہے، کاش یہ ڈسپلن علی گڑھ کو بھی نصیب ہو"۔ تاہم مختلف الطبائع افراد کے ایسے غیر معمولی مجمع میں خلاف طبع امور کا پیش آنا ایک طبعی بات ہے جس سے دنیا کا کوئی اجتماع مستثنیٰ نہیں ہو سکتا، اور پھر تعلیمی اداروں میں تو یوں بھی نوجوانوں کا اجتماع ہوتا ہے، جن کی زندگی الشباب شعبۃ من الجنون کی منزل میں ہوتی ہے، جس سے بعض اوقات معمولی معمولی باتوں پر شکائت اور شکر رنجی پیدا ہو کر جنون آمیز حرکات کا صدور ہو جانا ناگزیر ہے، ایسا موقع پیش آجانے پر دار الاقامہ کا فرض ہے کہ فوری کارروائی کرے اور فریقین کے بیانات اور شہادتوں کی روشنی میں شرعی فیصلہ صادر کرے، اور اگر جرم زیادہ سنگین ہو تو اپنی تجویز کے ساتھ فیصلہ کے لئے ادارۂ اہتمام میں بھیج دے،

شعبۂ صفائی

صحت عامہ بڑی حد تک صفائی پر موقوف ہے، اس لئے دار العلوم میں صفائی کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے، صفائی کی عمدگی کو دیکھکر ہر وارد وصادر اس کی تعریف پر مجبور ہو جاتا ہے، صفائی کے لئے کم وبیش دس بارہ خاکروب اور دو سقے مستقل طور پر ملازم ہیں، ان سے کام لینے کیلئے ایک نگراں مقرر ہے۔

شعبۂ روشنی اور پانی

دار العلوم میں بجلی کی روشنی کا انتظام ہے، درس گاہوں، دفاتر اور مسجد میں برقی پنکھے آویزاں ہیں، گرہ رگاہوں پر بھی برقی قمقمے لگے ہوئے ہیں، شب میں طلبا کے مطالعہ اور اسباق کی تکرار کے لئے چند درس گاہیں مخصوص ہیں، جن میں مقررہ اوقات میں روشنی کا انتظام رہتا ہے۔ پانی کے لئے متعدد کنویں ہیں، نیز دار الاقامہ کے احاطوں میں جابجا بورنگ کے نل اور پائپ لگے ہوئے ہیں، مسجد کے حوض کو بھرنے کے لئے برقی موٹر لگا ہوا ہے،

صدر المدرسین

دار العلوم میں دو عہدے ہمیشہ سے نہائت ممتاز رہے ہیں، ایک[1] صدارتِ تدریس اور دوسرا[2] اہتمام،

اہتمام کے لئے ایسی شخصیت کا انتخاب کیا جاتا ہے جو ذی علم اور صاحبِ اثر و وجاہت اور متدین ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجہ کی انتظامی قابلیت کی مالک ہو۔

اسی طرح صدارتِ تدریس کے لئے ایسی شخصیت منتخب کی جاتی ہے جو علم و فضل کے زبردست کمالات کے علاوہ زہد و تقویٰ میں بھی یگانۂ روزگار ہو،

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ استاذ العلماء حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ[1] کے فرزند رشید اور مایۂ ناز شاگرد تھے، ۱۳ صفر ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۴ء تاریخ پیدائش ہے اور منظور احمد تاریخی نام ہے، وطن میں قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد دہلی میں والد ماجدؒ سے علوم متداولہ کی تکمیل کی، سوانح قاسمی میں خود لکھتے ہیں کہ

استاذ العلماء مولانا مملوک علی صاحبؒ، مشہور متکلم عالم مولانا رشید الدین خاں دہلوی کے جو حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، ممتاز تلامذہ میں تھے، علماء دیوبند اسی سلسلۃ الذہب میں منسلک ہیں،

مولانا مملوک علی صاحبؒ دہلی کے اورنٹیل کالج میں جس کو ۱۷۹۲ء / ۱۲۰۶ھ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز حکام نے قائم کیا تھا، عربی کے استاذ تھے، یہ کالج ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ انقلاب میں بند ہو گیا، "م"

"حقیر کے اور مولوی صاحب (حضرت مولانا محمد قاسم قدس سرہٗ) کے علاوہ قرب نسب کے بہت سے روابط اتحاد تھے، ایک مکتب میں پڑھا، ایک وطن، ایک نسب، ہم زلف ہوئے، ایک استاد، ایک وقت میں علم حاصل کیا، اور بعض کتابیں مولانا سے بھی پڑھیں، ایک پیر کے مرید ہوئے، دو مرتبہ حج میں ہم سفر رہے اور ایک زمانہ دراز تک ساتھ رہے۔

علم معقول و منقول میں اپنے والد ماجد کے مثل تھے، ذہن نہایت رسا پایا تھا اور حق تعالیٰ نے عظیم الشان جامعیت عطا فرمائی تھی۔

والد ماجد کے انتقال کے بعد ملازمت پر اجمیر تشریف لے گئے، کچھ عرصہ کے بعد محکمۂ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر مقرر ہوئے، جب دار العلوم قائم ہوا تو حضرت مولانا نانوتویؒ نے صدر مدرسی کے لئے دیوبند طلب فرمایا، ہر چند اجمیر میں ڈیڑھ سو روپے کا گراں قدر مشاہرہ تھا، مگر آپ نے کمال ایثار فرماتے ہوئے دار العلوم کے ۲۵ روپے ماہانہ کو اس پر ترجیح دی اور دار العلوم میں درس حدیث جاری فرمادیا۔ آپ دار العلوم کے سب سے پہلے شیخ الحدیث ہیں، ۱۹ سال کی مدت میں ۱۵۱ طلباء نے آپ سے علوم نبویہ کی تحصیل کی جن میں مولانا عبد الحق پور قاضوی، مولانا عبد اللہ انبھٹوی، مولانا فتح محمد تھانوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا خلیل احمد انبہٹوی، مولانا احمد حسن امروہوی، مولانا فخر الحسن گنگوہی، مولانا حکیم منصور علیخاں مرادآبادی، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حافظ محمد احمد، اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمہم اللہ جیسے مشاہیر اور یگانۂ عصر علماء شامل ہیں۔

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اور ان کے تلامذہ کے فیض تعلیم کو دیکھتے ہوئے

اگر یہ کہا جائے تو قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ آج ہندوستان و پاکستان، افغانستان اور وسطِ ایشیا میں جس قدر علماء موجود ہیں وہ تقریباً سب کے سب اسی خوانِ علم کے زلّہ ربا ہیں، دار العلوم میں تدریس حدیث کے ساتھ فتویٰ نویسی کا کام بھی آپ ہی کے سپرد تھا۔

باوجودیکہ مزاج میں جلال اور "جذب" کا غلبہ تھا اور اس کے رعب واثر کا یہ عالم تھا کہ لوگ بات کرتے ہوئے گھبراتے تھے مگر آپ ہر شخص سے نہایت اخلاق و تواضع کے ساتھ پیش آتے تھے، مولانا کے کشف کے حیرت انگیز واقعات سننے میں آئے ہیں، "ایک مرتبہ چھتہ کی مسجد میں یہ ذکر چھڑا کہ انگریزوں نے ہندوستان میں ایسا زبردست تسلط حاصل کر لیا ہے کہ ان کا اکھڑنا آسان نہیں رہا، مولاناؒ اس مجلس میں موجود تھے چونک کر بولے کیا کہا"۔ رات کو اِن کی حکومت ہوگی اور دن کو اُن کی، ہندوستان بغیر جنگ کے صف کی طرح پلٹ جائے گا"۔

کون کہہ سکتا ہے کہ ۱۴-۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب میں ایسا ہی نہیں ہوا!

دوسرا واقعہ ارواحِ ثلاثہ میں ایک ایسے شخص کی روایت سے درج ہے جو خود اس وقت موجود تھا، اس کا بیان ہے کہ جس زمانہ میں ملکہ وکٹوریہ کی تاج پوشی کا جلسہ ہوا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ دہلی میں مقیم تھے، اور دن میں اکثر غائب رہتے تھے، راوی کہتا ہے کہ میں نے دریافت کیا کہ "آپ کہاں غائب رہتے ہیں؟"۔ فرمایا کہ "مجھے حکم ہوا ہے کہ نواحِ دہلی میں جس جس جگہ تمہارا قدم جائے گا وہ جگہ آباد کر دی جائے گی، اس لئے میں شہر کے اطراف میں گشت کیا کرتا ہوں تاکہ ویران شدہ مقامات پھر سے آباد ہو جائیں"۔ راوی کا بیان ہے کہ جن جن مقامات پر مولانا پھرے تھے وہ جگہ نئی دہلی کے نام سے آباد ہونی شروع ہو گئی ہے۔

وصال سے چند روز قبل وطن مالوف نانوتہ تشریف لے گئے تھے وہاں ۳ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ ۱۸۸۶ء کو داعئ اجل کو لبیک کہا۔

مولانا سید احمد صاحب دہلوی مولانا موصوف نہایت جلیل القدر علماء میں سے تھے، علوم معقول و منقول میں زبردست دستگاہ حاصل تھی خصوصاً فن ریاضی و ہیئت میں تو اُن کا آوازۂ شہرت یورپ تک پہنچا ہوا تھا، حضرت مولانا محمد قاسم قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ "مولوی سید احمد صاحب کو خداوند کریم نے فنون ریاضی میں وہ استعداد اور مناسبت عطاء فرمائی ہے کہ ان فنون کے موجدوں کو بھی شاید اتنی ہی ہو"، قیام دار العلوم کے تیسرے سال ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۹ء میں مدرس دوم کی حیثیت سے بلائے گئے، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی وفات پر مسند صدارت تفویض ہوئی، جس پر چھ سات سال تک فائز رہے، ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء میں دار العلوم سے علیحدگی اختیار کر کے بھوپال تشریف لے گئے اور وہیں انتقال فرمایا،

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ حضرت شیخ الہندؒ دار العلوم کے سب سے پہلے شاگرد ہیں، ان ہی نسبت کہا گیا ہے کہ جس نے سب سے پہلے استاد کے سامنے کتاب کھولی وہ محمود تھا، حضرت شیخ الہند کی پیدائش ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۳ء میں بریلی میں ہوئی، والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب بریلی میں محکمہ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر تھے، ابتدائی تعلیم اپنے مشہور عالم چچا مولانا مہتاب علی صاحب سے حاصل کی، قدوری اور شرح تہذیب پڑھ رہے تھے کہ دار العلوم کا قیام عمل میں آیا، آپ اس میں داخل ہو گئے، نصاب دار العلوم کی تکمیل کے بعد حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی خدمت میں رہ کر علم حدیث کی تحصیل فرمائی، فنون کی بعض اعلیٰ کتابیں والد ماجد سے پڑھیں، ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۴ء میں حضرت نانوتویؒ کے دست مبارک سے دستار فضیلت حاصل کی، زمانۂ تعلیم ہی میں آپ کا شمار حضرت نانوتوی کے اجلّہ تلامذہ میں ہوتا تھا۔ اور حضرت خاص طور سے شفقت فرماتے تھے، چنانچہ آپ کی اعلیٰ

علمی اور ذہنی صلاحیتوں کے پیش نظر دارالعلوم کی مدرسی کے لئے اکابر کی نظر انتخاب آپ پر پڑی اور ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۵ء میں مدرس چہارم کی حیثیت سے آپ کا تقرر عمل میں آیا، جس سے بتدریج ترقی فرما کر ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء میں صدارت کے منصب پر پہنچے۔

ظاہری علم و فضل کی طرح باطن بھی آراستہ تھا، صدارت تدریس کا مشاہرہ ۷۵ روپے تھا مگر آپ نے ۵۰ روپے سے زیادہ کبھی قبول نہیں فرمائے، بقیہ ۲۵ روپے دارالعلوم کے چندہ میں شامل فرما دیتے تھے، آپ کی زبردست علمی شخصیت کے باعث طلباء کی تعداد دو سو سے بڑھکر چھ سو تک پہنچ گئی تھی، آپ کے فیض تعلیم نے، مولانا محمد انور شاہؒ، مولانا حسین احمد مدنی مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا منصور انصاریؒ، مولانا مفتی کفائت اللہؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا سید اصغر حسین دیوبندی، مولانا سید فخر الدین، مولانا محمد اعزاز علی امروہی، مولانا محمد ابراہیم بلیاوی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا احمد علی لاہوری۔ جیسے مشاہیر علماء کی جماعت تیار کی،

آخر عمر میں جب جنگ طرابلس و بلقان کی وجہ سے مسلمانوں میں سخت ہیجان پھیلا ہوا تھا، آپ نے ہندوستان سے برطانوی حکومت کا اقتدار ختم کرنے کے لئے ایک زبردست سیاسی اسکیم تیار کی یہ ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء کا وہ زمانہ تھا کہ ابھی تک انڈین نیشنل کانگریس کا نصب العین حقوق طلبی کی حد سے آگے نہیں بڑھا تھا، لیکن حضرت شیخ الہندؒ کا قدم اس سے بہت آگے تھا، وہ ایک زبردست انقلاب برپا کر کے برطانوی گورنمنٹ کا تختہ ہی الٹ دینے کا نقشہ تیار کر رہے تھے، اس کے لئے آپ نے نہایت منظم اور باقاعدہ طریق پر ہندوستان سے برطانوی راج ختم کر دینے کا پروگرام مرتب کیا تھا، آپ کے شاگردوں اور رفقاء کار کی ایک بڑی جماعت جو ہند و بیرون ہند کے اکثر ممالک میں پھیلی ہوئی تھی، آپ کے مجوزہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے

نہائت سرگرمی اور جانبازی کے ساتھ کوشاں تھی، شاگردوں میں مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا محمد میاں منصور انصاری، مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری اور مولانا سید حسین احمد مدنی وغیرہم ایسے ارباب عزیمت و استقامت مل گئے تھے، حضرت شاہ صاحب نے دارالعلوم میں اپنے استاذ کی علمی نیابت کی اور باقی حضرات نے اُن کے سیاسی اور انقلابی پروگرام کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔

حضرت شیخ الہند انڈین نیشنل کانگریس کے طریقہ کار سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، مگر ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے باہر کی حکومتوں سے بھی اس سلسلہ میں مدد لینا ضروری ہے محض حقوق طلبی کی جنگ آزادی کے لئے کافی نہیں ہو سکتی، اس بنا پر آپ نے مولانا عبید اللہ سندھی کو ایک خاص مشن پر کابل جانے کا حکم اور مولانا منصور انصاری کو آزاد قبائل میں جہاد کی تلقین کے لئے بھیجا گیا، انگریز اس زمانہ میں جرمنی سے جنگ میں مصروف تھے،

رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں حضرت شیخ الہند کے اس پروگرام کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

"اگست ۱۹۱۵ء ۱۳۳۳ھ میں مولانا محمود حسن (شیخ الہند) کے ایک شاگرد مولوی عبید اللہ کابل چلے گئے اور وہاں پہنچ کر انھوں نے جرمنی اور ترکی مشن سے جو افغانستان آیا ہوا تھا مل کر امیر کابل پر برطانیہ کے خلاف زور ڈالا، اسی سال ستمبر میں مولوی محمود حسن مکہ مکرمہ چلے گئے اور وہاں سے انھوں نے غالب پاشا کا دستخطی اعلان مولوی محمد میاں کے ہاتھ، مولوی عبید اللہ کے پاس کابل بھیجا، جس میں برطانیہ کے خلاف جہاد کی ترغیب دی گئی تھی، ان لوگوں نے یہ طے کیا تھا کہ برطانیہ کو شکست دینے کے بعد

ہندوستان میں ایک عارضی حکومت قائم کی جائے جس کے پریزیڈنٹ راجہ مہندر پرتاپ سنگھ ہوں، جو ضلع متھرا کے ایک رئیس تھے، اور ۱۳۳۲ھ ۱۹۱۴ء میں یورپ چلے گئے تھے، اور برطانیہ کی مخالف سلطنتوں سے تعلق رکھتے تھے"

(رولٹ کمیٹی کی اردو رپورٹ ص ۲۵۳، ۲۵۴)

اس اسکیم میں حکومت کی صدارت کا منصب راجہ مہندر پرتاپ کے لئے تجویز کیا گیا تھا، اس لحاظ سے ہندوستان کو سیکولر اسٹیٹ بنانے کا یہ پہلا تصور تھا جو شیخ الہندؒ نے پیش فرمایا، مجوزہ اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے پیرانہ سالی کے باوجود ۱۳۳۳ھ ۱۹۱۵ء میں آپ نے حجاز کا سفر فرمایا، وہاں ترکی گورنر غالب پاشا اور انور پاشا سے جو اس وقت ترکی کے وزیر جنگ تھے ملاقات فرما کر بعض اہم امور طے کئے، انور پاشا کے مشورے کے مطابق آپ حجاز سے براہ بغداد بلوچستان ہوتے ہوئے سرحد کے آزاد قبائل میں پہنچنا چاہتے تھے کہ اچانک جنگ عظیم کے دوران میں شریف حسین والی مکہ ترکوں سے بغاوت کر کے برطانوی حکومت کا حلیف بن گیا، اور انگریز حکام کے ایماء پر آپ کو گرفتار کر کے ان کے حوالے کر دیا، انگریز پہلے آپ کو مصر اور وہاں سے مالٹا لے گئے، جو برطانوی قلمرو میں جنگی مجرموں کے لئے محفوظ ترین مقام سمجھا جاتا تھا، حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کے رفقاء کے بار بار بیانات لئے گئے، "سفر نامہ اسیر مالٹا" میں اس کی پوری تفصیلات درج ہیں، مالٹا میں چار سال تک مع رفقاء نظر بند رکھا گیا، جب جنگ ختم ہوئی تو بمشکل آپ کو ہندوستان آنے کی اجازت ملی، ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ ۱۹۲۰ء کو آپ نے ساحل بمبئی پر قدم رنجہ فرمایا، دیوبند پہنچ کر آپ سب سے پہلے دار العلوم میں تشریف لائے بعد ازاں مکان تشریف لے گئے۔

ہندوستان پہنچتے ہی حضرت شیخ الہندؒ تحریک خلافت میں شریک ہو گئے، ترک موالات

کا شرعی فتویٰ آپ ہی نے شائع فرمایا تھا جس سے ملک میں زبردست ہیجان پیدا ہو گیا، حتیٰ کہ علی گڈھ کالج تک کو لوگ توڑنے پر آمادہ ہو گئے، حضرت شیخ الہندؒ سخت علیل تھے، لیکن اسی حالت میں آپ کو علی گڑھ لے جایا گیا اور جامعہ ملیہ کا (جو بعد کو دہلی منتقل ہو گئی) افتتاح آپ کے ہاتھ سے کرایا گیا، اس موقع پر آپ نے ایک زبردست سیاسی خطبہ دیا تھا جو ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

غرض کہ آپ کی ذات ستودہ صفات علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے علاوہ سیاست و تدبر میں بھی کامل دستگاہ رکھتی تھی، اگرچہ مالٹا سے واپسی کے بعد صحت بگڑ چکی تھی اور قویٰ پیرانہ سالی کے باعث نہائت ضعیف ہو گئے تھے مگر بایں ہمہ آپ نے نہائت شد و مد کے ساتھ سیاسی کاموں میں حصہ لیا، طبیعت اس بار گراں کی متحمل نہ ہو سکی، اسی دوران میں علی گڈھ کا سفر پیش آیا، واپسی کے بعد جب حالت زیادہ تشویش ناک ہو گئی تو بغرض علاج دہلی لے جایا گیا، ڈاکٹر انصاری صاحب کے یہاں قیام ہوا، اور وہی معالج قرار پائے حکیم اجمل خاں صاحب بھی شریک علاج تھے، مگر وقت قریب آچکا تھا ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۱ء کی صبح کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا، جنازہ دیوبند لایا گیا اور اگلے روز حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی قبر مبارک کے قریب یہ گنجینۂ فضل و کمالات دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہو گیا۔

شاگردوں میں بے شمار علماء و فضلاء کے علاوہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ، ایضاح الادلہ، احسن القریٰ، الابواب والتراجم اور مختلف فتاویٰ اور سیاسی خطبات تصنیفی یادگار ہیں۔

حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ

شاہ صاحبؒ کشمیر کے رہنے والے تھے، ۲۷ ر شوال ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۶ء کو سادات کے ایک معزز

علمی خاندان میں آپ کی ولادت ہوئی، یہ خاندان اپنے علم وفضل کے لحاظ سے کشمیر بھر میں ممتاز ترین خاندان سمجھا جاتا تھا، ساڑھے چار سال کی عمر میں اپنے والد بزرگوار مولانا سید معظم شاہ صاحب سے قرآن مجید شروع کیا، غیر معمولی ذہانت و ذکاوت اور بے مثل قوتِ حافظہ ابتدائے عمر سے موجود تھی، چنانچہ ڈیڑھ سال کی قلیل ترین مدت میں کتاب اللہ کے ساتھ فارسی کی چند ابتدائی کتابیں ختم کر کے علوم متداولہ کی تحصیل میں مشغول ہوگئے اور ابھی بمشکل ۱۴ سال کی عمر تھی کہ حصول علم کے جذبۂ بے پایاں نے ترکِ وطن پر آمادہ کر دیا، اور تقریباً تین سال ہزارہ کے مرکزی مدارس میں رہ کر مختلف علوم وفنون میں دستگاہ حاصل کی، مگر دیوبند کی شہرت نے مزید تکمیل کے لئے بے چین بنا دیا، چنانچہ ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء میں دیوبند تشریف لائے، حضرت شیخ الہندؒ مسند صدارت پر متمکن تھے، استاد نے شاگرد کو اور شاگرد نے استاد کو پہلی ہی ملاقات میں پہچان لیا، تفسیر و حدیث کی کتابیں شروع کیں، اور چند ہی سال میں دار العلوم میں شہرت ومقبولیت اور ایک امتیازی شان حاصل کر لی، دار العلوم سے فارغ ہو کر آپ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سند حدیث کے علاوہ باطنی فیوض سے بھی مستفیض ہوئے کچھ عرصہ تک دہلی اور وطن میں درس و تدریس میں مشغول رہنے کے بعد دیوبند تشریف لائے اور کئی سال تک دار العلوم میں بغیر مشاہرہ کے کتب حدیث کے درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، علمی ذوق کا طبیعت پر اس قدر غلبہ تھا کہ عرصہ تک نکاح اور متاہل زندگی سے گھبراتے رہے، مگر بالآخر بزرگوں کے شدید اصرار سے متاہلانہ زندگی اختیار فرمالی تھی اور اس کے بعد تنخواہ بھی لینے لگے تھے، ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵ء کے اواخر میں جب حضرت شیخ الہندؒ نے سفر حجاز کا قصد فرمایا تو اپنی جانشینی کا فخر شاہ صاحبؒ

کو بخشا، دار العلوم کی مسند صدارت پر تقریباً ۱۲ سال تک جلوہ افروز رہے۔ ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۸ء
کے اوائل میں اہتمام دار العلوم سے بعض اختلافات کے باعث آپ فرائض صدارت
سے دست کش ہو کر جنوبی ہند کے مدرسہ ڈابھیل میں تشریف لے گئے، اور ۱۳۵۱ھ / ۱۹۳۳ء تک
وہاں درس حدیث کا مشغلہ جاری رہا۔

شاہ صاحب اگر ایک طرف اپنے معاصرین میں تبحر علمی کے لحاظ سے اپنا ثانی نہ رکھتے
تھے تو دوسری جانب زہد و تقویٰ میں بھی اُن کی ذات بے مثل تھی، وہ ایک باکمال مفسر
محدث، فقیہ اور فلسفی تھے، آدمی میں ایک کمال کا ہونا بھی کم نہیں ہوتا۔ مگر ان کی دستارِ
کمال میں متعدد لعل آویزاں تھے، حقیقت یہ ہے کہ ان کے وجود سے علمی دنیا میں ایک
انقلاب پیدا ہو گیا تھا، تشنگان علوم کی جس کثیر تعداد نے اس بحر العلوم سے سیرابی
حاصل کی وہ آپ اپنی مثال ہے، روم سے لیکر چین تک ان کے فیضان علمی کا سیلاب
موجیں مارتا رہا، اور ہند و بیرون ہند کے ہزاروں تشنگان علوم نے اس سے اپنی
پیاس بجھائی، ہند، عرب، ایران، افغانستان، چین، مصر، جنوبی افریقہ اور انڈونیشیا
میں بکثرت آپ کے تلامذہ پھیلے ہوئے ہیں۔

قدرت کی جانب سے حافظہ ایسا عدیم النظیر بخشا گیا تھا کہ ایک مرتبہ کی دیکھی ہوئی
کتاب کے مضامین و مطالب تو درکنار عبارتیں تک مع صفحات و سطور کے یاد رہتیں،
اور دوران تقریر میں بے تکلف حوالے پہ حوالے دیتے چلے جاتے تھے، اسی کے ساتھ
مطالعہ کا اس قدر شوق تھا کہ جملہ علوم کے خزانے اُن کے دامن جستجو کی وسعتوں کو
مطمئن اور تشنگی علم کو سیراب نہ کر سکتے تھے، کثرت مطالعہ اور قوت حافظہ کے باعث
گویا ایک متحرک و متکلم کتب خانہ تھے، صحاح ستہ کے علاوہ حدیث کی اکثر کتابیں تقریباً

برزبان تھیں، تحقیق طلب مسائل جن کی جستجو اور تحقیق میں عمریں گذر جاتی ہیں سائل کے استفسار پر چند لمحوں میں اس قدر جامعیت کے ساتھ جواب دے دیتے تھے کہ اس موضوع پر سائل کو نہ تو شبہ باقی رہتا تھا اور نہ کتاب دیکھنے کی ضرورت باقی رہتی تھی اور پھر مزید لطف یہ کہ کتابوں کے ناموں کے ساتھ صفحات و سطور تک کا حوالہ بھی تبلا دیا جاتا تھا، وہ ہر ایک علم و فن پر اس طرح برجستگی کے ساتھ تقریر فرماتے تھے کہ گویا اُن کو تمام علوم مستحضر اور کالنقش فی الحجر ہیں، دوران تقریر بے شمار کتابوں کے حوالے بلا تکلف دیتے چلے جاتے تھے، حتیٰ کہ اگر کسی کتاب کے پانچ پانچ اور دس، دس حواشی ہوتے تو ہر ایک کی عبارت بقید صفحہ و سطر یاد ہوتی تھی، احادیث کا تمام ذخیرہ اور اُن کی صحت و عدم صحت کے متعلق طویل و عریض بحثیں، رُوات کے مدارج و مراتب برنوک زبان تھے، مشہور و معروف کتب خانوں کی اکثر مخطوطات نظر سے گذر چکی تھیں اور اس طرح حافظہ میں محفوظ تھیں کہ گویا آج ہی ان کا مطالعہ کیا ہے۔

پھر مطالعہ محض علوم شرعیہ تک ہی محدود نہ تھا بلکہ جس فن کی بھی کتاب ہاتھ آتی اس کا شروع سے آخر تک ایک مرتبہ مطالعہ ضرور فرما لیتے تھے، اور جب کبھی اس کے متعلق بحث چھڑ جاتی تو اس کتاب کے مندرجات کو اس طرح حوالوں کے ساتھ بیان فرما دیتے کہ سننے والا حیران و ششدر رہ جاتا، ایک مرتبہ کسی شخص نے علم جفر کے مشکل ترین مسائل حل کرنے کے لئے پیش کئے، شاہ صاحب نے حسب معمول برجستہ جوابات کے ساتھ متعدد کتب کے حوالے دے کر تبلا دیا کہ فلاں فلاں کتابوں کی جانب رجوع کیا جائے،

غرض کہ علوم تفسیر و حدیث اور فقہ کی جس قدر خدمات آپ نے انجام دیں وہ

آپ اپنی مثال ہیں، متعدد معرکۃ الآراء مسائل پر کتابیں بھی تصنیف فرمائی ہیں، درس حدیث کی تقریر کی جامعیت کا اندازہ "فیض الباری" سے کیا جاسکتا ہے جو صحیح بخاری کی تقریر ہے اور چار ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے، درایت میں اس قدر زبردست کمال حاصل تھا کہ وہ مختلف و معارض اقوال میں اپنی قوت استنباط کے زور سے بلا تکلف ایک کو دوسرے پر ترجیح دے دیتے تھے۔

علوم نقلیہ و عقلیہ کے علاوہ علم تصوف میں بھی زبردست مہارت تھی اور اس علم کی تقریباً ہر اہم کتاب پر مبصرانہ نظر تھی، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے شاہ صاحبؒ کی وفات پر معارف میں لکھا تھا کہ

"ان کی مثال اس سمندر کی سی تھی جس کی اوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قیمت خزانوں سے معمور ہوتی ہے، وہ وسعت نظر، قوت حافظہ اور کثرت حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے، علوم حدیث کے حافظ و نکتہ شناس، علوم ادب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر و سخن سے بہرہ مند اور زہد و تقویٰ میں کامل تھے، مرتے دم تک علم و معرفت کے اس شہید نے قال اللہ وقال الرسول کا نعرہ بلند رکھا۔"

مصر کے مشہور زمانہ عالم سید رشید رضا جب دیوبند تشریف لائے اور شاہ صاحبؒ سے اُن کی ملاقات ہوئی تو بے ساختہ بار بار کہتے تھے

ما رأیت مثل ھذا الاستاذ الجلیل ! میں نے اس جلیل القدر استاد جیسا کوئی عالم نہیں دیکھا،

بہرحال دارالعلوم کی یہ خوش قسمتی تھی کہ حضرت شیخ الہندؒ کے بعد صدارت تدریس کا کام آپ کے سپرد ہوا، بقول مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی آپ کے زمانہ میں طلباء کی ذہنیت میں بڑا انقلاب ہوا، اور اچھے اچھے مستعد طلباء آپ کے حلقۂ درس سے مستفید ہوکر اُٹھے،

ملکی سیاست میں شاہ صاحبؒ اپنے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کے مسلک کے پیرو اور برطانوی حکومت کے سخت ترین مخالف تھے، مسلمانانِ ہند میں صحیح اسلامی زندگی پیدا کرنا علماء کا اولین فریضہ سمجھتے تھے، جمعیۃ علماء ہند کے آٹھویں سالانہ اجلاس منعقدہ پشاور کا بصیرت افروز خطبۂ صدارت اس کا روشن ثبوت ہے۔

ڈابھیل میں چند سال قیام فرمانے کے بعد آخر میں امراض کی شدت سے مجبور ہو کر دیوبند جس کو آپ نے اپنا وطن اقامت بنا لیا تھا چلے آئے تھے، اور یہیں ۳ر صفر المظفر ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۴ء میں ۶۱ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔ قبر مبارک عیدگاہ کے قریب ہے، علامہ اقبال مرحوم کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں اسلام سے جو شغف پیدا ہو گیا تھا، اس میں شاہ صاحبؒ کے فیضانِ صحبت کو بھی بڑا دخل حاصل ہے، علامہ موصوف نے اسلامیات میں شاہ صاحبؒ سے بہت کچھ استفادہ کیا تھا، چنانچہ علامہ اقبال مرحوم آپ کا بے حد احترام کرتے اور عقیدت و محبت کے جذبات کے ساتھ شاہ صاحبؒ کی رائے کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتے تھے۔

مختلف اسلامی مباحث پر عربی اور فارسی میں ایک درجن سے زائد تصانیف جو نہایت معرکۃ الآراء مسائل پر مشتمل ہیں زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں، اور اُن سے کہیں زیادہ کتابیں طباعت کی منتظر ہیں۔

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی

حضرت ممدوح کا وطن موضع اللہ داد پور ٹانڈہ ضلع فیض آباد ہے، ۱۹ر شوال ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء کو ضلع اُناؤ کے ایک قصبہ بانگر مئو میں جہاں آپ کے والد ماجد سید حبیب اللہ صاحب ہیڈ ماسٹر تھے پیدا ہوئے، آپ حسینی سید ہیں ۱۹ پشت پیشتر آپ کا خاندان ہندوستان

آیا تھا، اپنے علم و تقویٰ کے لحاظ سے یہ خاندان ہمیشہ ایک خاص عظمت اور شاہی زمانہ میں ایک بڑی جاگیر کا مالک تھا،

ابتدائی تعلیم پرائمری اسکول میں حاصل کرنے کے بعد ۱۳۰۹ھ ۱۸۹۲ء میں آپ دیوبند تشریف لائے، یہاں حضرت شیخ الہندؒ نے خاص شفقت و عنایت سے آپ کی تعلیم و تربیت فرمائی، دارالعلوم کے نصاب کی تکمیل اور سات سال یہاں کے علمی ماحول میں گذارنے کے بعد جب وطن مالوف تشریف لے گئے تو والد ماجد شوق ہجرت میں مدینۃ الرسول کے لئے رخت سفر باندھ چکے تھے آپ بھی والدین کے ہمراہ روانہ ہو گئے، روانگی حجاز سے قبل آپ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ سے بیعت ہو چکے تھے، مکہ مکرمہ میں پیر و مرشد کی ہدایت کے بموجب کچھ عرصہ تک حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس اللہ سرہٗ سے کسب فیض کیا، بعد ازاں مدینہ منورہ میں والد ماجد کے ساتھ مقیم ہو گئے، ہر چند آپ نے ہندوستان سے ہجرت کا قصد نہیں فرمایا تھا، تاہم والد صاحب کی حیات تک آغوش پدری کو چھوڑ کر ہندوستان واپس آنا پسند نہیں کیا۔

قیام مدینہ کے زمانہ میں تقریباً ۱۰ سال تک مسجد نبوی میں درس حدیث کی خدمت مالی تنگی اور عسرت کے باوجود توکلاً علی اللہ انجام دی، عموماً روزانہ ۱۲، ۱۲ گھنٹے تک مسلسل درس و تدریس کا مشغلہ جاری رہتا تھا، مختلف جماعتیں یکے بعد دیگرے حاضر ہو کر آپ کے فیضان علمی سے سیراب ہوتی تھیں، مسجد نبوی میں آپ کا درس حدیث وہاں کے تمام شیوخ حدیث سے زیادہ پسندیدہ اور مقبول تھا اور اس کی شہرت نے مختلف اسلامی ممالک کے طالبان علم کی ایک بڑی تعداد کو آپ کے گرد جمع کر دیا تھا، حجاز کی مقدس سرزمین اور خاص مسجد نبوی میں ایک ہندوستانی عالم کی جانب اس قدر کشش اور قبول عام کا باعث آپ کے

طرزِ درس کی اس خصوصیت کو سمجھنا چاہیے، جو آپ کو دارالعلوم کے اساتذہ سے ورثہ میں ملی تھی۔

مدینہ منورہ کے قیام کے زمانہ میں آپ کئی مرتبہ ہندوستان تشریف لائے، اور حضرت گنگوہی سرہٗ سے خلعتِ خلافت حاصل فرمایا، ۱۳۲۹ھ ۱۹۱۱ء میں تقریباً ایک سال دیوبند قیام فرماکر تدریسی خدمات انجام دیں، ۱۳۳۳ھ ۱۹۱۵ء میں جب حضرت شیخ الہندؒ حجاز تشریف لے گئے تو آپ ہی کے پاس قیام فرمایا، اور آپ ہی کے ذریعہ سے ترکی کے وزیر جنگ انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات فرماکر اپنی انقلابی اسکیم مرتب کی تھی، جب عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی اور شریف حسین نے حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کرکے انگریزوں کے حوالہ کیا تو آپ بھی حضرت شیخ الہندؒ کے رفقاءِ اسارت میں شامل تھے، چنانچہ چار سال تک آپ کو بھی مالٹا میں جنگی قیدی کی حیثیت سے رہنا پڑا، ۱۳۳۸ھ میں جب مالٹا سے رہائی ہوئی تو آپ حضرت شیخ الہندؒ کی معیت میں ہندوستان تشریف لائے، اور اس وقت سے اب تک یہیں مقیم ہیں، مالٹا سے واپسی کا زمانہ ۱۹۱۹ء کی تحریک خلافت کے آغاز کا زمانہ تھا، آپ نے یہاں پہنچکر حضرت شیخ الہندؒ کی قیادت میں پوری قوت کے ساتھ سیاسی کام شروع کردیا، ملک اور بالخصوص مسلمانوں کو آپ کی ذات پر بڑا اعتماد تھا، اور آپ کی مجاہدانہ اور سرفروشانہ قربانیوں نے مسلمانوں کے دلوں کو آپ کی عظمت و محبت سے لبریز کردیا تھا، حضرت شیخ الہند کی وفات پر متفقہ طور سے آپ کو ان کا جانشین تسلیم کرلیا گیا، سیاسی کاموں میں شرکت و انہماک کے باعث آپ کو متعدد مرتبہ کئی کئی سال تک جیل میں بھی رہنا پڑا۔

۱۳۴۶ھ ۱۹۲۸ء میں جب حضرت شاہ صاحبؒ دارالعلوم سے مستعفی ہوئے تو آپ کے سوا جماعت دارالعلوم میں کوئی ایسی شخصیت موجود نہ تھی جو دارالعلوم کی اس مہتم بالشان جگہ کو

اس کے شایان شان پُر کر سکے اس لئے اکابر کی نظر انتخاب آپ ہی پر پڑی اور اس وقت سے آپ دار العلوم کی مسند صدارت پر فائز ہیں، آپ کے زمانۂ صدارت میں طلباء کی تعداد میں دو گنے سے بھی زیادہ اضافہ ہوا، اور خاص دورۂ حدیث کی جماعت میں تو یہ اضافہ تین گنے سے بھی متجاوز ہے،

آپ کا درس حدیث مضامین کے تنوع، کثرت اور جامعیت کے لحاظ سے اس وقت دنیائے اسلام میں اپنی نوعیت کا واحد درس ہے چنانچہ اس کی عظمت و شہرت اور کشش سال بسال طلباء کی تعداد میں اضافہ کا موجب ہوتی رہی ہے، حدیث نبوی میں آپ کے تلامذہ کا حلقہ اس قدر وسیع ہے کہ ممالک اسلامیہ کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں آپ کے شاگرد موجود نہ ہوں، جس طرح آج دنیائے اسلام میں دار العلوم کو علوم نبویہ کی تعلیم میں خاص طغرائے امتیاز حاصل ہے اسی طرح آپ کا علمی فیضان بھی آپ اپنی مثال ہے،

حضرت مولانا مدظلہ، کے روزانہ مشاغل اور معمولات یہ ہیں، "آخر شب میں نماز فجر تک تہجد اور ذکر و وظائف وغیرہ، نماز فجر کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ تلاوت قرآن مجید اور مطالعہ کتب، اس کے بعد مردانے میں مہمانوں کے ساتھ چائے اور ناشتہ پھر تقریباً ۱۲ بجے تک صحیح بخاری اور ترمذی شریف کا درس، دوپہر کے کھانے اور نماز ظہر کے بعد ڈاک دیکھنا اور خطوط کے جواب لکھنا، اور مہمانوں سے بات چیت، نماز عصر کے بعد مغرب تک پھر صحیح بخاری کا درس ہوتا ہے، مغرب کی نوافل میں کم از کم ایک پارہ کی تلاوت کا روزانہ معمول ہے، اس سے فراغت کے بعد رات کا کھانا اور نماز عشاء، نماز کے بعد بھی اکثر صحیح بخاری کا درس ہوتا ہے جو ۱۲ بجے شب تک جاری رہتا ہے۔

دسترخوان نہائت وسیع ہے، عموماً دس پندرہ مہمان آپ کے دسترخوان پر موجود رہتے ہیں۔

سال کا اکثر حصہ اسفار میں گذرتا ہے، ہندوستان بھر کی قومی اور مذہبی جماعتوں کی ضرورتیں متواتر سفر پر مجبور کرتی رہتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ کثرت اسفار سے درس و اسباق میں جو حرج واقع ہوتا ہے، عصر اور عشاء کے بعد کے اوقات میں درس کا اضافہ کرکے اس کمی کو پورا فرماتے ہیں۔

مہتممین

حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ

حاجی صاحبؒ دیوبند کے نہایت متقی، پرہیزگار اور صاحب اثر بزرگ تھے، تعویذات اور عملیات کے فن میں دُور دُور تک شہرت تھی، بناءِ دارالعلوم کے شریک کار تھے، دارالعلوم کا منصب اہتمام اولاً آپ ہی کے سپرد ہوا تھا، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی نظم "تحسین دارالعلوم" میں فرماتے ہیں۔ ؎

ہم شریک مشورہ، اے نورِ عین	ہست، حضرت حاجی عابد حسین
عاملِ کامل، ولی، مردِ خدا	پائے او در پائے فخرِ انبیاء
ہم جمالی، ہم جلالی، شانِ او	کانِ حلم و مخزنِ خلقِ نکو
نقش و تعویذش مثالِ نقشِ قدر	فیضِ او بر خاص و عامی مثلِ بدر

حاجی صاحبؒ کا سالِ ولادت ۱۲۵۰ھ ۱۸۳۴ء ہے، زمانۂ تعلیم کی نوعمری میں تصوف کا شوق دامن گیر ہوا اور متعدد بزرگوں سے خلعت خلافت حاصل کیا، میاں حاجی کریم بخش رامپوریؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس اللہ سرہٗ سے بھی شرف خلافت حاصل تھا، مشہور ہے کہ ۳۰ سال تک آپ کی تکبیر اولیٰ فوت نہیں ہوئی، نماز تہجد کا ایسا التزام تھا کہ ۶۰ سال تک قضا رکی نوبت نہیں آئی، رشد و ہدایت اور تذکیر و تزکیۂ قلوب کے علاوہ آپ کو "فن عملیات" میں زبردست ملکہ حاصل تھا، لوگ دُور دُور سے تعویذات و عملیات کے لئے حاضر ہوتے اور دامنِ امید گوہر مراد سے بھر کر لوٹتے تھے، مختلف کاموں کی کثرت کے باوجود ضبطِ اوقات کا بے حد التزام تھا، اور ہر کام ٹھیک اپنے وقت پر انجام پاتا

تھا، آخر شب میں بیدار ہوتے، نماز تہجد اور اوراد و وظائف سے فارغ ہو کر فجر کی نماز چھتہ کی مسجد میں ادا فرماتے، نماز کے بعد تلاوت فرما کر حجرہ سے باہر تشریف لاتے بیعت کے خواہش مندوں کو بیعت فرماتے اور تعویذات کے طالبین کو تعویذ مرحمت ہوتے، دوپہر تک یہ سلسلہ جاری رہتا، بعد ظہر متوسلین طریقت حاضر ہوتے اس وقت ذکر و شغل ہوتا اور عصر تک رہتا، بعد مغرب ختم خواجگان کا معمول تھا، عشاء کے بعد اول وقت سو جاتے تھے

تعویذات کے ضرورت مند بعض اوقات حد سے زیادہ پریشان کرتے، مگر اخلاق و تواضع کا یہ عالم تھا کہ کبھی ترش رُو ہوتے نہیں دیکھا گیا، اتباع سنت کا غائت اہتمام تھا، ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ مریدین میں حاجی محمد انور صاحب دیو بندیؒ نے نفس کشی کے طور پر کھانا پینا قطعًا ترک کر دیا ہے، آپ نے بتاکید ان کو لکھا کہ "یہ امر سنت کے خلاف ہے، بطریق مسنون ضرور کھانا پینا چاہیئے خواہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو، (ملفوظات انوری ص)

دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کی رکنیت کے علاوہ تین مرتبہ اہتمام آپ کے سپرد ہوا، پہلی مرتبہ یوم تاسیس سے ۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۸ء تک، دوسری مرتبہ ۱۲۸۶ھ / ۱۸۷۰ء سے ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۲ء تک، اور تیسری مرتبہ ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۹ء سے ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۳ء تک مجموعی طور پر یہ مدت ۱۰ سال ہوتی ہے،

جامع مسجد دیوبند کی تعمیر بھی آپ ہی کی جد و جہد اور سعی و کوشش کا نتیجہ ہے، آخر میں کثرت مصروفیت کے باعث آپ اہتمام سے مستعفی ہو گئے تھے آپ کے اثر و وجاہت سے دارالعلوم کو کافی فوائد حاصل ہوئے اور اس کا ہر قدم ترقی کی جانب گامزن رہا

پنجشنبہ، ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۳ء کو ۸۱ سال کی عمر میں وفات پائی۔ "مدار المہام بہشت بریں" مادہ سنِ وفات ہے،

حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ مولانا موصوف ۱۲۵۲ھ / ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے،

حضرت شاہ عبد الغنی دہلویؒ کے مخصوص خلفاء میں تھے، گو علمی حیثیت بہت معمولی تھی لیکن انتظامی امور کا زبردست ملکہ حاصل تھا اور اس بارے میں عجیب و غریب صفات کے مالک تھے، اُن کا شمار اپنے زمانے کے اولیاء کاملین میں تھا، دو مرتبہ دار العلوم کے مہتمم مقرر ہوئے، پہلی مرتبہ ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۸ء و ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۹ء میں حاجی صاحبؒ کی غیبوبت میں اہتمام کی خدمات انجام دیں، پھر تقریباً ۳ سال کے بعد ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۲ء میں مستقل مہتمم قرار پائے، اور ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء کے اوائل تک اس منصب پر فائز رہے، آپ کے زمانہ میں دار العلوم نے بڑی ترقی کی، جس کو بڑی حد تک آپ کے حُسنِ انتظام کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے، سُنا ہے کہ دیانت و امانت کے ساتھ انتظامی سلیقہ کا بہت کم اجتماع ہوتا ہے مگر ان میں بدرجۂ اتم موجود تھا کل مدت اہتمام تقریباً ۱۹ سال ہے،

دار العلوم کی اکثر ابتدائی عمارتیں آپ ہی کے زمانۂ اہتمام میں تعمیر ہوئیں، فنِ تعمیر میں اُن کی مہارت کا اندازہ اُس زمانہ کی عمارتوں بالخصوص نودرہ وغیرہ کی پختگی، استواری اور حسنِ تعمیر سے کیا جا سکتا ہے، یہ عمارت دار العلوم کی عمارتوں میں ایک ممتاز شان اپنے اندر لئے ہوئے ہے، ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۶ء میں جب نودرہ کی عمارت کی (جو موجودہ عمارتوں میں سب سے پہلی عمارت ہے) بنیاد کھدوائی گئی تو آپ نے خواب دیکھا کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجوزہ مقام پر تشریف رکھتے ہیں اور ان سے خطاب فرما رہے ہیں کہ "یہ احاطہ تو بہت مختصر ہے" یہ فرما کر خود عصائے مبارک سے احاطہ و عمارت کا نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ "ان نشانات پر تعمیر کی جائے"۔"

مولانا نے صبح اُٹھ کر دیکھا تو نشانات موجود تھے، چنانچہ اُن ہی نشانات پر بنیاد کھدوا کر تعمیر شروع کرائی گئی،

۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء میں آپ بقصد ہجرت مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور وہیں دو سال بعد ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء میں انتقال فرمایا۔ اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

منشی فضل حق صاحبؒ منشی صاحب مرحوم دیوبند کے خاندان سادات سے تھے حضرت نانوتوی قدس سرہٗ سے شرفِ بیعت حاصل تھا یہ شروع سے مجلس شوریٰ کے رکن تھے، نیز ابتداءً حاجی صاحبؒ کے زمانۂ اہتمام میں سربراہ کار کی حیثیت سے دار العلوم کی خدمات انجام دیں۔

۱۳۱۰ھ/۱۸۹۳ء میں حاجی صاحبؒ کے مستعفی ہو جانے پر مہتمم مقرر ہوئے، اور تقریباً ایک سال اس خدمت کو انجام دے کر مستعفی ہو گئے۔

مولانا محمد منیر صاحب نانوتویؒ مشہور عالم و مصنف مولانا محمد احسن نانوتویؒ کے بھائی تھے یہ بھی ایک سال سے کچھ زائد مہتمم رہ کر مستعفی ہو گئے، دیانت و امانت میں ان کا بڑا پایہ تھا، "ارواح ثلاثہ" میں ان کے متعلق ایک واقعہ لکھا ہے کہ "وہ دار العلوم کی سالانہ روداد چھپوانے کے لئے ڈھائی سو روپے لیکر دہلی گئے، اتفاق سے وہاں روپے چوری ہو گئے، مولانا اس حادثہ کی کسی کو اطلاع کئے بغیر اپنے وطن نانوتہ آئے، اور زمین فروخت کر کے روپیہ فراہم کیا اور اُس سے روداد چھپوا کر لائے، کچھ عرصہ کے بعد جب ارکان مجلس شوریٰ کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے حضرت گنگوہیؒ سے اس کی نسبت شرعی مسئلہ دریافت کیا، وہاں سے جواب آیا کہ مہتمم صاحب امین تھے، اور روپیہ چونکہ بلا تعدی کے ضائع ہوا، اس لئے ان پر تاوان نہیں آسکتا ارکان مجلس نے حضرت گنگوہیؒ کا فتویٰ دکھلا کر اُن سے درخواست کی کہ اپنا روپیہ واپس لے لیں، مہتمم صاحب نے فرمایا کہ فتویٰ کی بات نہیں، اگر خود مولاناؒ کو ایسا واقعہ پیش آتا تو کیا

وہ بھی روپیہ لے لیتے ہیں، چنانچہ باصرار روپیہ لینے سے انکار فرمادیا۔"

(ارواح ثلاثہ ص ۳۲۱)

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ

حافظ صاحبؒ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے صاحب زادے ہیں، ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۳ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے، قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد والد ماجد نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے لئے گلاؤٹھی (ضلع بلند شہر) بھیجدیا، گلاؤٹھی میں حضرت نانوتویؒ کا قائم کردہ مدرسہ تھا مولانا عبداللہ انبہٹوی اس مدرسہ میں مدرس تھے، بعدازاں اعلیٰ کتب کی تعلیم کے لئے مرادآباد کے مدرسہ شاہی میں بھیجے گئے، یہاں حضرت نانوتویؒ کے شاگرد رشید مولانا احمد حسن صاحبؒ امروہی پڑھاتے تھے، ان سے مختلف علوم و فنون کی معتد بہ کتابیں پڑھنے کے بعد دیوبند تشریف لائے، اور حضرت شیخ الہندؒ سے معقول و ادب کی اعلیٰ کتب کی تعلیم حاصل کی، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے ترمذی شریف کے چند سبق پڑھے، دورۂ حدیث گنگوہ پہنچ کر حضرت گنگوہیؒ کے حلقۂ درس میں پورا کیا، اور وہیں جلالین اور بیضاوی پڑھیں،

۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۶ء میں بحیثیت مدرس دارالعلوم میں تقرر ہوا، اور مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھانے کی نوبت آئی، ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۳ء میں جب حضرت حاجی صاحبؒ اہتمام سے علیحدہ ہوئے تو یکے بعد دیگرے دو مہتمم مقرر ہوئے مگر ایک ایک سال سے زیادہ اہتمام نہ کرسکے، ہر سال کے تغیرات کی وجہ سے دارالعلوم کے نظام میں اختلال پیدا ہونے لگا تو ۱۳۱۳ھ / ۱۸۹۶ء میں حضرت گنگوہیؒ نے اہتمام کے لئے حافظ صاحبؒ کا انتخاب فرمایا حافظ صاحبؒ کی شخصیت نہایت ذی علم، منتظم اور صاحب اثر و وجاہت تھی، چنانچہ آپ

بہت جلد دارالعلوم کے انتظام پر قابو یافتہ ہوگئے، اور تقرر کے وقت آپ سے جو توقعات قائم کی گئی تھیں بدرجۂ اتم ان کے اہل ثابت ہوئے، حضرت شیخ الہندؒ جو صدر المدرسین تھے خود اُستاد ہونے کے باوجود حافظ صاحبؒ کے استاد زادہ ہونے کی حیثیت کو زیادہ اہمیت دیتے تھے،

حافظ صاحبؒ کے زمانۂ اہتمام میں دارالعلوم نے جس قدر ترقی کی وہ آپ اپنی مثال ہے، مختصر یہ ہے کہ جب آپ نے عنان ادارت اپنے ہاتھ میں لی تھی تو دارالعلوم کی آمدنی کا اوسط ۵-۶ ہزار روپے سالانہ تھا، آپ کے عہد میں یہ اوسط ۹۰ ہزار تک ترقی کر گیا، اسی طرح طلباء کا اوسط دو، ڈھائی سو سے ترقی کر کے تقریباً ۹ سو تک پہنچ گیا، اس وقت کتب خانہ میں ۵ ہزار کتابیں تھیں، آپ کے زمانہ میں کتابوں کی تعداد ۴۰ ہزار تک پہنچ گئی، ۱۳۱۳ھ ۱۸۹۶ء تک عمارات دارالعلوم کی مالیت ۳۶ ہزار روپے تھے، آپ کے عہد میں یہ مالیت ۴ لاکھ تک پہنچ گئی تھی، غرض کہ آپ کے دور اہتمام میں دارالعلوم نے معنوی اور صوری دونوں حیثیتوں سے نہایت عظیم الشان ترقی کی، جو اس سے پہلے اس کو حاصل نہ ہو سکی تھی، ہرچند دارالعلوم معنوی حیثیت سے "دارالعلوم" بن چکا تھا، مگر ظاہری شکل و صورت کے لحاظ سے آپ ہی کے زمانۂ اہتمام میں مدرسہ سے دارالعلوم بنا، شعبہ جات اور دفاتر کی تشکیل عمل میں آئی، حلقۂ اثر میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا، غرض کہ ہر حیثیت سے دارالعلوم کا قدم روزافزوں ترقی کی جانب گام زن رہا، چنانچہ آپ کا دور اہتمام دارالعلوم کی تاریخ میں اس کی ترقیوں کا نہایت تابناک اور زریں دور سمجھا جاتا ہے،

دارالحدیث کی عظیم الشان عمارت جو اپنی نوعیت کی ہندوستان بھر میں پہلی

عمارت ہے ان ہی کے عہد میں تیار ہوئی، جدید دار الاقامہ کا آغاز اور مسجد و کتب خانہ کی تعمیر بھی حافظ صاحبؒ کے زمانہ کی یادگاریں ہیں، ۱۳۲۸ھ ۱۹۱۱ء کے اس عظیم الشان جلسۂ دستار بندی کی یاد اب تک لوگوں کے قلوب میں تازہ ہے، جس میں ایک ہزار سے زائد فضلاء کی دستار بندی ہوئی تھی،

دار العلوم کی ترقی کے سلسلہ میں حافظ صاحبؒ نے ملک کے مختلف شہروں کے بڑے بڑے سفر کر کے دار العلوم کے لئے بہت سے دوامی چندے مقرر کرائے، خصوصاً بھوپال، بھاولپور اور حیدر آباد کے سفر تو دار العلوم کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ حیدر آباد سے دار العلوم کی امداد سو روپے ماہانہ مقرر تھی، حافظ صاحبؒ حیدر آباد تشریف لے گئے اور اپنے اثرات سے ڈھائی سو مقرر کرائے، دوسرے سفر میں پانچ سو اور تیسرے میں ایک ہزار ماہانہ تک نوبت پہنچ گئی جو بحمد اللہ آج تک جاری ہے،

برطانوی گورنمنٹ کی جانب سے آپ کو "شمس العلماء" کا خطاب دیا گیا تھا۔ مگر آپ نے دار العلوم کے حریت پسندانہ مسلک کی بناء پر حکومت کا خطاب یافتہ ہونا پسند نہیں کیا، چنانچہ خطاب واپس کر دیا، یہ بھی آپ ہی کے زمانہ کی خصوصیت ہے کہ دو مرتبہ صوبہ متحدہ کے گورنر دار العلوم میں آئے، دار الحدیث کی مجوزہ جگہ پر شہر کے پانی کا گندہ نالہ بہتا تھا اس کے سبب سے دار الحدیث کی تعمیر میں رکاوٹ پڑی ہوئی تھی، نیز گندہ نالہ کے قرب کے باعث دار العلوم کی آب و ہوا بھی خراب رہتی تھی، اکابر دار العلوم کی پیہم کوششوں کے باوجود مقامی حکام نالہ کے ہٹائے جانے پر آمادہ نہ تھے، حضرت حافظ صاحبؒ نے گورنر صوبہ کو دعوت دے کر اس مشکل

کا حل نکال لیا، چنانچہ صوبائی گورنمنٹ کے حکم سے سرکاری مصارف پر گندہ نالہ ہٹا دیا گیا، حافظ صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ دار العلوم کی مشکل سے مشکل مہم کو بھی آسانی سے سلجھا دیتے تھے،

طلباء کی چھوٹی چھوٹی جزئیات پر جہاں ہر وقت نظر رہتی تھی اور ان پر روک ٹوک اور ڈانٹ ڈپٹ رکھتے وہیں اُن پر بے حد شفیق اور مہربان بھی تھے، طلباء کی معمولی معمولی ضرورتوں پر مربیانہ نظر رہتی تھی، بیمار طلباء کے علاج پر خاص توجہ فرماتے تھے، طلباءؔ اور مدرسین پر حافظ صاحبؒ کا رعب و داب ضرب المثل تھا، دسترخوان نہایت وسیع تھا۔ دار العلوم کے مہمانوں کا بار بذات خود نہایت فراخ حوصلگی کے ساتھ برداشت کرتے تھے

شروع سے درس و تدریس کا جو مشغلہ قائم ہو گیا تھا وہ زمانۂ اہتمام میں بھی کبھی بند نہیں ہوا، مشکوٰۃ المصابیح، جلالین شریف صحیح مسلم، ابن ماجہ، مختصر المعانی، رسالہ میر زاہد وغیرہ کتابیں نہایت شوق سے پڑھاتے تھے، تقریر نہایت صاف و مربوط اور سلجھی ہوئی ہوتی تھی، اپنے والد ماجد کے خاص علوم اور مضامین پر کافی عبور تھا،

دار العلوم اور اس کی خدمات سے والہانہ تعلق کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہو گا کہ حافظ صاحبؒ نے اپنی جان بھی بالآخر دار العلوم پر قربان کر دی، نظام دکن نے حافظ صاحبؒ کو ریاست حیدرآباد میں مفتی اعظم کے عہدہ پر مقرر فرمایا تھا، حکومت آصفیہ کے اس سب سے بڑے دینی منصب پر آپ سنہ ۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۳ء سے سنہ ۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۶ء تک فائز رہے، حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں آپ نے نظامِ حیدرآباد کو دار العلوم میں تشریف ارزانی کی دعوت دی تھی، جو اس شرط کے ساتھ منظور کر لی گئی تھی کہ نظام جب دہلی تشریف لے جائیں گے تو دار العلوم کو بھی ضرور دیکھیں گے، سنہ ۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۹ء میں نظام کے دہلی آنے کی توقع

تھی، اس لئے آپ حیدر آباد تشریف لے گئے، تاکہ نظام صاحب کو دار العلوم میں تشریف لانے کا وعدہ یاد دلا کر پہلے سے پروگرام بنوا لیں۔ جس وقت آپ حیدر آباد کے لئے روانہ ہو رہے تھے تو طبیعت ناساز تھی، ضعف پیری اور مسلسل علالت نے بہت کمزور کر دیا تھا مگر دار العلوم کے مفاد کے لئے اپنی صحت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے آپ حیدر آباد روانہ ہو گئے، وہاں پہنچ کر طبیعت زیادہ خراب ہو گئی، پہلے تو انتظار رہا کہ طبیعت سنبھلے تو حضور نظام سے ملاقات کی جائے، مگر جب مرض دن بدن بڑھتا ہوا معلوم ہوا تو متوسلین اور رفقاء سفر کی رائے قرار پائی کہ دیوبند واپس لے جایا جائے چنانچہ واپسی کے قصد سے آپ حیدر آباد سے روانہ ہو گئے، مگر ابھی ٹرین حیدر آباد کی حدود ہی میں تھی کہ نظام آباد اسٹیشن پر آپ جان، جانِ آفریں کے سپرد کر کے من مات فی السفر فھو شھید میں داخل ہو گئے، یہ ۳ جمادی الاولی ۱۳۴۷ھ ۱۹۲۹ء کا واقعہ ہے، وفات سے قبل زبان پر ذکر اللہ جاری تھا، ۲۹ کے عدد پر عقد انامل تھا کہ اللہ کے لفظ کے ساتھ روح پرواز کر گئی۔

نظام آباد اسٹیشن پر نعش اتار کر جنازہ تیار کیا گیا، متعلقین اور حضور نظام کو تار کے ذریعہ اطلاع دی گئی، حضور نظام کا جواب آیا کہ حافظ صاحبؒ کا جنازہ حیدر آباد لایا جائے، نظام آباد اور حیدر آباد میں متعدد مرتبہ نماز جنازہ پڑھی گئی، اگلے دن ۴ جمادی الاولیٰ کو قبیل عصر حضور نظام نے اپنے مصارف پر مخصوص قبرستان میں جو "خطیرۂ صالحین" کے نام سے موسوم ہے اس شہید دار العلوم کو شاہانہ اعزاز کے ساتھ سپرد خاک کرایا، اور باغ عامہ کی مسجد میں تعزیتی تقریر کرتے ہوئے نہایت تأسف کے ساتھ یہ پُر اثر جملہ فرمایا کہ

"افسوس وہ مجھے لینے آئے تھے، مگر خود یہیں رہ گئے" ــــــــــ

حافظ صاحبؒ نے اسلام اور مسلمانوں کی دارالعلوم کے ذریعہ جو بیش بہا خدمات انجام دیں اُن کے پیش نظر ان کی وفات کو نہ صرف دارالعلوم میں بلکہ تمام اسلامی ہند میں ایک ناقابل تلافی نقصان محسوس کیا گیا، ہندوستان کے طول وعرض میں دیوبندی اور غیر دیوبندی جماعتوں میں بے شمار تعزیتی جلسے اور ایصال ثواب کے اجتماعات کئے گئے،

حافظ صاحبؒ نے ۴۵ سال دارالعلوم کی خدمات انجام دیں، ابتدائی ۱۰ سال تعلیم وتدریس میں اور ۳۵ سال ادارۂ اہتمام میں۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ آپ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ کے خلف الرشید تھے، شروع سے آخر تک دارالعلوم میں علوم کی تکمیل کی، آپ ایک متبحر عالم اور عربی زبان کے زبردست ادیب تھے، تدبُّر، سیاست، انتظام اور دوراندیشی دارالعلوم کی تاریخ میں ضرب المثل سمجھی جاتی تھی، دارالعلوم کی حیرت انگیز ترقی میں ان کی خدمات اور خداداد صفات کو بڑا دخل حاصل ہے،

سنہ ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۸ء میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کی مصروفیتوں کے باعث نیز دارالعلوم کو ترقی دینے کے سلسلے میں ایک ایسے لائق اور منتظم شخص کی ضرورت پیش آئی جو انتظامی امور اور ترقی کی تجاویز میں حافظ صاحب کا ہاتھ بٹا سکے، اس کے لئے آپ سے زیادہ موزوں کوئی دوسرا شخص موجود نہ تھا، چنانچہ آپ کے انکار کے باوجود آپ کو مجبور کر کے نیابت اہتمام کا منصب آپ کے سپرد کر دیا گیا، کہا جاتا ہے کہ دارالعلوم کی یہ

خوش قسمتی تھی کہ اس کو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ جیسا کام کرنے والا بیدار مغز، منتظم، بافراست اور مخلص ہاتھ آگیا، اہتمام کے کاموں میں ان کو اس قدر شغف تھا، کہ شب و روز کا بیشتر حصہ اسی میں صرف ہوتا تھا، انھوں نے دارالعلوم کے شعبہ انتظام و انصرام کو اتنا منظم اور مستحکم کر دیا تھا، کہ جب حکومت آصفیہ کی جانب سے نواب صدر یار جنگ بہادر دارالعلوم کے حسابات کی تنقیح کیلئے دیوبند آئے تو اُن کو یہ دیکھکر حیرت ہوگئی کہ ایک، ایک اور دو، دو آنے تک کے حسابات کے کاغذات اور رسیدیں باضابطہ طور پر نہائت صاف حالت میں فائل میں موجود تھیں۔ نواب صاحب موصوف کا بیان ہے کہ کوئی کاغذ ایسا نہ تھا جو مانگا گیا ہو اور فوراً پیش نہ کر دیا گیا ہو، حافظ صاحب کے عہد اہتمام کی ترقی درحقیقت آپ ہی کی رفاقت کا نتیجہ سمجھی جاتی ہے، آپ ہمیشہ ان کے دست راست، معتمد علیہ اور نائب رہے،

سنہ ۱۳۴۴ھ میں جب حافظ صاحبؒ اپنی پیرانہ سالی کے باعث حیدر آباد کے مفتیٔ اعظم کے منصب سے سبکدوش ہوئے تو ان کی جگہ پر آپ کا تقرر عمل میں آیا، لیکن دارالعلوم میں داخلی اختلافات رونما ہو جانے کے سبب سے آپ کو بہت جلد اس عظیم منصب سے دست کش ہو جانا پڑا، حضرت شاہ صاحبؒ، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، اساتذہ اور طلباء کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ دارالعلوم سے علیحدہ ہو گئے تھے، دارالعلوم کے لئے یہ بڑا نازک موقع تھا، مگر آپ کے عزم و استقلال، ہمت و جرأت اور دانش و تدبر نے دارالعلوم کی کشتی کو ڈگمگانے سے بچا لیا،

حضرت مولانا مرحوم کی شخصیت ہر حیثیت سے یگانۂ روزگار تسلیم کی جاتی تھی،

عام خیال ہے کہ اگر آپ کو ملکی سیاست میں بھی اتنا ہی شغف ہوتا جیسا کہ دارالعلوم کے ساتھ تھا تو آپ ہندوستان کے سب سے بڑے سیاسی لیڈر ثابت ہوتے، حضرت شیخ الہندؒ کی وصیت تھی کہ ارکان جمعیۃ العلماء، کو دو آدمیوں کو کبھی نہیں چھوڑنا چاہیئے، ان میں پہلا نام آپ ہی کا تھا، چنانچہ آپ جمعیۃ العلماء کے ہمیشہ بہترین مشیر ثابت ہوئے، سنہ ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۲ء میں جمعیۃ العلماء کا جو اجلاس گیا دصوبہ بہار، میں ہوا تھا، اُس میں آپ کو صدر منتخب کیا گیا، آپ کا خطبۂ صدارت نہ صرف عام طور پر بہت پسند کیا گیا بلکہ اس کی سیاسی اہمیت کو ملک کے سیاسی حلقے تک تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے تھے!

مطالعہ کے شوق نے آپ کو نہائت وسیع المعلومات بنا دیا تھا، حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ

"اگر مجھ پر کسی کے علم کا اثر پڑتا ہے تو وہ مولانا حبیب الرحمٰن ہیں"۔

عربی ادب اور تاریخ سے خاص ذوق تھا، اور ان علوم کی وسیع النظری مشہور زمانہ تھی، مندرجہ ذیل تصانیف علمی یادگار چھوڑی ہیں۔

(۱)۔ قصیدہ لامیۃ المعجزات" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں تقریباً تین سو اشعار پر مشتمل ہے، جن میں آنحضرت صلعم کے ایک سو معجزے نہائت فصیح و بلیغ انداز میں پیش کئے گئے ہیں، شیخ الادب حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب نے عربی اشعار کی سلیس اردو میں شرح فرما دی ہے،

(۲)۔ اشاعتِ اسلام" دنیا میں اسلام کیوں کر پھیلا"؟ اس سوال کے جواب میں تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ان تاریخی واقعات کو پیش کیا گیا ہے، جو نفسیاتی

اعتبار سے اشاعت اسلام کا باعث ہوئے،

(۳)۔ تعلیمات اسلام، اس کتاب میں اسلام کے طرز حکومت کو بیان کیا گیا ہے، اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ مشورہ امیر جماعت کے لئے کس قدر ضروری ہے، اس ضمن میں آپ نے بتلایا ہے کہ امیر کی ذات پر اگر کلی اعتماد ہو تو اکثریت و اقلیت کی رائے شماری کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر امیر پر یہ اعتماد حاصل نہ ہو تو پھر کام چلانے کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ اکثریت کا اعتبار کیا جائے۔

(۴)۔ "رحمۃ للعالمین"۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ایک نہائت گراں قدر تصنیف ہے، افسوس ہے کہ یہ ناتمام ہے، مگر جس قدر حصہ لکھا جا چکا ہے وہ سیرت نبوی کی تصانیف کی فہرست میں ایک عظیم الشان تصنیف کا اضافہ کرتا ہے، یہ کتاب ابھی تک طبع ہو کر منظر عام پر نہیں آسکی،

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ نہائت نحیف الجثہ تھے، خوراک حیرت انگیز طور پر کم تھی، مگر ضعف اور کم زوری کے باوجود بے پناہ ہمت کے مالک تھے،!

حضرت حافظ صاحبؒ کے انتقال کے ٹھیک چودہ ۱۴ ماہ کے بعد چار ۴ رجب ۱۳۴۸ھ / ۱۹۳۰ء کی شب میں اس جہان فانی سے رحلت فرمائی۔ اور ہمیشہ کے لئے دارالعلوم کو اپنا مداح چھوڑ گئے، نور اللہ مرقدہٗ!

حضرت مولانا محمد طیبؒ صاحب

۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے، ۷ سال کی عمر میں دارالعلوم میں داخل کیا گیا، دو ۲

سال کی قلیل ترین مدت میں قرآن مجید قرأت و تجوید کے ساتھ حفظ کیا، پانچ سال فارسی اور ریاضی کے درجات میں تعلیم حاصل کر کے دارالعلوم کا عربی کا نصاب شروع کیا، جس سے سنہ ۱۳۳۷ھ میں فراغت اور سند فضیلت حاصل کی، دوران تعلیم میں آپ کی آبائی نسبت کے سبب سے اساتذہ نے اعلیٰ پیمانہ اور مخصوص طریق پر تعلیم و تربیت میں حصہ لیا، حدیث کی خصوصی سند آپ کو وقت کے مشاہیر علماء واساتذہ سے حاصل ہوئی، علامۃ العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ علم حدیث میں آپ کے خاص استاذ ہیں۔

تکمیل کے بعد آپ نے دارالعلوم میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا ذاتی علم وفضل، ذہانت و ذکاوت اور آبائی نسبت و وجاہت کے باعث بہت جلد طلباء میں آپ کے ساتھ گرویدگی پیدا ہوگئی، اوائل سنہ ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۵ء میں نائب مہتمم کے منصب پر آپ کا تقرر کیا گیا، جس پر اوائل سنہ ۱۳۴۸ھ/۱۹۳۰ء تک آپ اپنے والد ماجد اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کی زیر نگرانی ادارۂ اہتمام کے انتظامی معاملات میں حصہ لیتے رہے، وسط ۱۳۴۸ھ/۱۹۳۰ء میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کے انتقال کے بعد آپ کو مہتمم بنا دیا گیا، سابقہ تجربہ، اہلیت کار اور آبائی نسبت کے پیش نظر یہ ثابت ہو چکا تھا، کہ آپ کی ذات میں اہتمام دارالعلوم کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے، چنانچہ مہتمم ہونے کے بعد آپ نے بہت جلد اپنے علم وفضل اور خاندانی وجاہت و اثر کی بناء پر ملک میں مقبولیت اور عظمت حاصل کر لی، جس سے دارالعلوم کی عظمت و شہرت کو کافی فوائد حاصل ہوئے، چنانچہ دارالعلوم نے آپ کے زمانۂ اہتمام میں نمایاں ترقی حاصل کی، ۱۳۴۸ھ/۱۹۳۰ء میں جب آپ نے انتظام دارالعلوم کی باگ ڈور

ہاتھ میں لی اس کے انتظامی شعبے آٹھ تھے اور اب اٹھارہ ہیں، اس وقت دارالعلوم کی سالانہ آمدنی کا بجٹ ۲۶۲ ، ۵۰ روپے تھا، آپ کے زمانہ میں تین لاکھ تک پہنچ گیا۔ ۱۳۴۸ھ ۱۹۳۰ء میں ملازمین دارالعلوم کے عملہ میں ۵۴، افراد تھے، اور اب ۱۲۵ ہیں۔

اسی طرح عمارتوں میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے، دارالتفسیر، دارالافتاء دارالقرآن، مطبخ جدید، فوقانی دارالحدیث، بالائی مسجد، باب الظاہر، جدید دارالاقامہ جیسی عظیم الشان عمارتوں کی تعمیر و تکمیل ممدوح ہی کے دورِ اہتمام کی یادگاریں ہیں۔

غرض کہ دارالعلوم کے ہر شعبہ نے آپ کے دورِ اہتمام میں نمایاں ترقی کی ہے، دارالعلوم کی مجالس انتظامیہ و شوریٰ نے مختلف اوقات میں آپ کی غیر معمولی خدمات کے اعتراف اور اظہارِ قدردانی کے سلسلہ میں متعدد ریزولیشن پاس کئے ہیں جو دارالعلوم کی سالانہ رودادوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

علمی سلسلہ میں درس و تدریس کے علاوہ فنِ خطابت و تقریر میں آپ کو خداداد ملکہ اور قوت گویائی حاصل ہے اور زمانۂ طالب علمی ہی سے آپ کی تقریریں پبلک جلسوں میں شوق کے ساتھ سُنی جاتی ہیں، اہم سے اہم مسائل پر دو دو، تین تین گھنٹے مسلسل تقریر کرنے اور ٹھوس علمی مواد پیش کرنے میں آپ کو کوئی رکاوٹ اور تکلف نہیں ہوتا، حقائق اور اسرارِ شریعت کے بیان و ایجادِ مضامین میں آپ کو خاص قدرت حاصل ہے جسے ملک کے بڑے بڑے اہلِ علم تسلیم کر چکے ہیں جدید تعلیم یافتہ طبقہ آپ کے علمی اور حکیمانہ اسلوبِ بیان سے خاص طور پر

محظوظ ہوتا ہے، مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں آپ کی تقریریں خاص طور پر مقبول ہیں، اور بعض معرکۃ الآراء تقریریں خود یونیورسٹی سے شائع ہو چکی ہیں، ملک کے ہر علمی اور اسلامی طبقہ کی جانب سے آپ کو مدعو کیا جاتا ہے اور ملک کا کوئی خطہ ایسا نہیں جس میں آپ کی تقریروں کی گونج نہ پہنچی ہو،

جمیعۃ علماء کے سالانہ اجلاسوں میں آپ کے خطبات صدارت بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں، بڑے بڑے شہروں میں آپ کی علمی تقریروں سے ایک خاص حلقہ اثر پیدا ہو گیا ہے، بیرون ہند میں بھی آپ کی خطابت کے اثرات وہاں کے علمی حلقوں میں پہنچ چکے ہیں، ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۵ء میں بسلسلہ سفر حجاز آپ نے ہندوستان کے ایک مؤقر وفد کے صدر کی حیثیت سے سلطان ابن سعود کے دربار میں ایک شاندار تقریر فرمائی، جس پر سلطان بہت مؤثر ہوئے، اور بوقت رخصت شاہی خلعت اور بیش قیمت کتب کے عطیہ سے اعزاز بخشا۔

۱۳۵۸ھ / ۱۹۴۰ء میں آپ کا سفر افغانستان علمی خدمات کی ایک مستقل تاریخ ہے، آپ نے دار العلوم کے نمائندہ کی حیثیت سے دار العلوم اور حکومت افغانستان کے درمیان علمی وعرفانی روابط قائم کرنے کے لئے یہ سفر اختیار فرمایا تھا، افغانستان کے علمی حلقوں نے شایان شان خیر مقدم کیا، حکومت نے اپنی میزبانی کے شرف سے نوازا، افغانستان کی علمی وادبی سرکاری اور غیر سرکاری انجمنوں اور سوسائٹیوں نے مدعو کیا، آپ کی عالمانہ تقریروں سے وہاں کے علمی اور ادبی حلقے بہت متاثر ہوئے۔

دار العلوم کے انتظامی امور کے علاوہ جن چیزوں سے آپ کو طبعی دلچسپی ہے

وہ تعلیم و تدریس اور دعوت و تبلیغ ہیں، اور یہی چیز ملک میں آپ کی امتیازی سمجھی جاتی ہے۔ تفریحی ذوق، مطالعہ کتب اور تصنیف و تالیف ہے، آپ کا یہ مشغلہ دارالعلوم کے انتظامی معاملات اور اوقات درس و تدریس کے علاوہ ہمیشہ جاری رہتا ہے بالخصوص دوران سفر کے فارغ اوقات کلیۃً اسی میں صرف ہوتے ہیں، زمانۂ قیام میں مغرب سے عشاء تک مردانے میں مجمع رہتا ہے، جس کا موضوع عموماً علمی مذاکرے ہوتے ہیں شاعری سے بھی مناسبت ہے، متعدد نظمیں شائع ہو چکی ہیں، تصانیف کی تعداد بہت کافی ہے، ان میں سے مندرجہ ذیل تصانیف اور خطبات چھپ چکے ہیں۔

"التشبہ فی الاسلام، مشاہیر امت، کلمات طیبات، الطیب الثمر فی مسئلۃ القضاء والقدر۔ سائنس اور اسلام، تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام، مسئلہ زبان اور ہندوستان، دین اور سیاست، اسباب عروج و زوال اقوام، اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام، الاجتہاد والتقلید، اصول دعوتِ اسلام، اسلامی مساوات، تفسیر سورۂ فیل، فطری حکومت"

حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ[۱]	حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ کے

۱۔ مولانا عثمانیؒ کا دور صدارت اہتمام ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۶ء سے شروع ہو کر ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۴ء میں ختم ہو گیا، اس پورے زمانہ میں حضرت مولانا محمد طیب صاحب بدستور مہتمم رہے، اور بحمد اللہ آج بھی ممدوح اس منصب پر فائز ہیں۔ "م"

فرزند رشید تھے، ١٣٠٥ھ/١٨٨٨ء میں دیوبند میں پیدا ہوئے، ٧ سال کی عمر میں دار العلوم کے درجۂ قرآن مجید میں داخل ہوئے، دار العلوم کے اساتذہ سے علوم کی تکمیل کی، فراغت کے بعد دہلی کے مدرسہ فتح پوری میں صدر مدرس مقرر ہوئے وہاں سے ١٣٢٨ھ میں آپ کو دار العلوم میں بلا لیا گیا۔ یہاں عرصہ تک درجۂ علیا کی مختلف بڑی بڑی کتابیں پڑھائیں، خصوصاً آپ کا صحیح مسلم کا درس بڑی شہرت رکھتا تھا، حضرت نانوتوی رح کے علوم پر خاص نظر تھی۔

١٣٤٦ھ/١٩٢٨ء کے اختلاف میں دار العلوم سے علیحدگی اختیار کرکے ڈابھیل تشریف لے گئے، حضرت شاہ صاحب رح کی وفات کے بعد ١٣٥١ھ/١٩٣٣ء میں جامعہ ڈابھیل کے صدر المدرسین مقرر ہوئے، ١٣٥٤ھ/١٩٣٦ء میں دار العلوم کے صدر مہتمم کی حیثیت سے آپ کا انتخاب کیا گیا، مگر چند سال کے بعد ١٣٦٢ھ/١٩٤٤ء میں بعض اختلاف کی بنا پر آپ کو دوبارہ دار العلوم سے علیحدہ ہونا پڑا۔

علم وفضل فہم وفراست، تدبر اور اصابت رائے کے لحاظ سے علامہ عثمانی کا شمار ہندوستان کے چند مخصوص علماء میں ہوتا تھا، وہ زبان وقلم دونوں کے یکساں شہسوار تھے، اور تحریر وتقریر پر بدرجۂ اتم قدرت حاصل تھی، حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے ترجمۂ قرآن پر آپ کے تفسیری حواشی علمی دنیا میں زبردست شاہکار سمجھے جاتے ہیں، آپ حالات حاضرہ اور جدید ذہنیتوں پر بڑی گہری نفسیاتی نظر رکھتے تھے، اس لئے آپ کی تقریر وتحریر عوام وخواص دونوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی،

علم الکلام   الاسلام، العقل والنقل، اعجاز القرآن، حجاب شرعی،

الشہاب الثاقب، وغیرہ ان کی معرکۃ الآراء تصانیف ہیں۔

علم الحدیث میں آپ کی زبردست تصنیف "فتح الملہم"، حنفی نقطۂ نظر سے صحیح مسلم کی پہلی شرح ہے، جس کو ہندوستان و پاکستان کے علاوہ ممالک عربیہ میں بھی خاص طور پر پسند کیا گیا ہے،

سیاسیات میں آپ اولاً جمیعۃ العلماء ہند کے ساتھ شریک تھے، مگر بعد میں مسلم لیگ کے حامی ہو گئے، اور جمیعۃ علماء اسلام کے صدر منتخب کئے گئے، تقسیم ہند سے قبل رمضان ۱۳۶۶ھ ۱۹۴۷ء کے دوسرے عشرے میں آپ پاکستان تشریف لے گئے۔ اور کراچی میں قیام فرما لیا تھا، پاکستان دستور ساز اسمبلی کے رکن اور شرعی دستور ساز کمیٹی کے صدر رہے، پاکستان میں آپ نے بہت سی دینی اور ملی خدمات انجام دیں، پاکستان کے اقتدار اعلیٰ پر آپ کی علمی اور سیاسی خدمات کا خاص اثر تھا، خصوصاً آپ کو عالمانہ اور مفکرانہ حیثیت سے خاص عظمت حاصل تھی اور آپ کی دینی رہنمائی کے ساتھ ساتھ سیاسی رہنمائی بھی مسلم سمجھی جاتی تھی۔

۲۲ صفر المظفر ۱۳۶۹ھ ۱۹۴۹ء کو بغداد الجدید (ریاست بھاولپور) میں جہاں آپ ریاست بھاولپور کے وزیر تعلیم کی دعوت پر ایک عربی درس گاہ کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے تشریف لے گئے تھے، چند گھنٹے کی علالت کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا جنازہ سرکاری حیثیت سے بغداد الجدید سے کراچی لے جایا گیا، اور قیام گاہ واقع محمد علی روڈ کے قریب سپرد خاک کر دیا گیا۔

تمت

مصنف کی دوسری کتابیں

(۱) دارالعلوم دیوبند کی مختصر تاریخ اور اس کا نشو وارتقاء

دارالعلوم دیوبند کس طرح ایک معمولی مکتب سے ایشیاء کے مسلمانوں کا سب سے بڑا علمی اور دینی مرکز بن گیا؟ دارالعلوم کی ۹۰ سالہ تاریخ اور اُس کے نشو وارتقاء کی دل آویز تفصیلات اور حیرت انگیز ترقی۔ قیمت ۱۲ر (زیر طبع)

(۲) دارالعلوم دیوبند ایک نظر میں

دارالعلوم کی شاندار اور پُرشکوہ عمارتوں کا دل کش مرقع۔ جس کو دیکھکر دارالعلوم کا سماں نظروں میں پھرنے لگتا ہے! قیمت ۸ر (زیر طبع)

(۳) دارالعلوم دیوبند کا کتب خانہ

دارالعلوم کے عظیم الشان کتب خانہ کی تاریخ، اس کا نظم ونسق اور نادر الوجود مخطوطات کا تعارف، قیمت ۶ر (زیر طبع)

(۴) دارالعلوم دیوبند کی تعلیمی خصوصیات

طریق تعلیم میں دارالعلوم کی ممتاز خصوصیات اور جدید وقدیم طریقۂ تعلیم میں اس کا مابہ الامتیاز کارنامہ۔ قیمت ۴ر (زیر طبع)

۵ دارالعلوم دیوبند کا حیرت انگیز بجٹ

مستقل آمدنی نہ ہونے کے باوجود دارالعلوم کے تین ساڑھے تین لاکھ روپے سالانہ کے مصارف کس طرح پورے ہوتے ہیں؟ اس کی داستان سُن کر آپ محو حیرت ہو جائیں گے، اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ دارالعلوم کی ترقی یقیناً کسی باطنی قوت کا نتیجہ ہے! قیمت ۱؍ (زیر طبع)

۶ تذکرہ آل ابراہیم"

دیوبند کے خاندان سادات کی دلچسپ تاریخ، گیارہویں صدی ہجری میں صوفیا، کی اشاعت اسلام کی خدمات اور اُن کی دعوت و تبلیغ کے نتائج۔ (زیر طبع قیمت کچھ نہیں)

ناشر

ادارہ:۔ تاریخ دیوبند۔ دیوبند۔ یوپی

Rizvi SM

Tārikh-i-Darul 'Ulūm
Deoband vols I & II
Idarah-i-Ihtamām,
Darul 'Ulum Deoband
1977.